وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

ماہنامہ

# میثاق

لاہور

زیر سرپرستی
مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر مسئول
اسرار احمد

جلد ۱۳ مارچ ۱۹۶۷ء شمارہ ۳

## فہرست

* تذکرہ و تبصرہ ——— اسرار احمد ۲
* تدبر قرآن ——— مولانا امین احسن اصلاحی ۱۷
تفسیر سورۂ نساء (قسط اول)
* افادات فراہی ———
حکومت الٰہی پر شہادت خالد مسعود ۳۷
* مقالات ———
ہنگامہ عید: ایک محرک فکریہ اسرار احمد ۴۴
طلبہ کے مسائل اور ان کا حل 〃 ۴۹
* ایک اہم اعلان ——— ۶۲

خط کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
دار الاشاعت الاسلامیہ بالمقابل ڈاکخانہ کرشن نگر لاہور-۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تذکرہ و تبصرہ

اگر کوئی یہ کہے کہ — "پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا" — تو پورے ملک میں شاید کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکل سکے جو اس کی تردید کرے! — لیکن اگر سوال یہ ہو کہ — "تحریکِ پاکستان کا اصل محرک مذہبی و دینی تھا — یا معاشی و معاشرتی؟" — تو اس کے جواب میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے!

حال ہی میں لاہور کے ایک انگریزی روزنامے کے کالموں میں پاکستان کے ایک مشہور و معروف کالم نویس نے اس بحث کو چھیڑا ہے۔ اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ:

"تحریکِ پاکستان ہرگز ایک مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ دراصل اس کے پیکر میں (برِصغیر کے مسلمانوں کی) صرف قومی امنگوں کا اظہار ہوا تھا....."

بہت سے لوگوں کے نزدیک ان کالم نویس صاحب کی بات شاید اس لئے قابلِ توجہ نہ ہو کہ وہ 'حکومت کے ملازم' ہیں — لیکن جہاں تک اس نظریئے کا تعلق ہے۔ یہ صرف ان کا نہیں ہے بلکہ مرحوم حسین شہید سہروردی جو نہ صرف یہ کہ تحریکِ مسلم لیگ کے پرانے کارکن تھے بلکہ جنہیں بجا طور پر پاکستان میں حزبِ اختلاف کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے — اور جو یہاں پارلیمانی جمہوریت کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ بارہا ان سے کہیں زیادہ واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کر چکے ہیں — اور حال ہی میں پاکستان کے ایک دوسرے بزرگ سیاستدان اور تحریکِ پاکستان کے پرانے کارکن جناب نور الامین نے بھی ایک ماہنامے کے ایڈیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نظریئے کی تائید کی ہے —!

واقعہ یہ ہے کہ سوائے ان عوام الناس کے جنہیں ان معاملات کا شعور ہی نہیں ہوتا یا ان معدودے چند لوگوں کے جو صرف مذہب کے سہارے ملکی سیاست کے میدان میں داخل ہو جانے کی بنا پر تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں — باقی جو شخص بھی غیر جانبداری



کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرے گا۔ وہ اس نظریے کی صداقت سے انکار کی جرأت نہ کر سکے گا!

---

اللہ تعالیٰ حکیم اور علیم ہے — اور اپنی حکمتوں کو وہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم بظاہر جو کچھ نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ برِصغیر کے مسلمانوں کی بھی بدقسمتی تھی اور خود اسلام کی بھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تحریک کو ابتدا ہی سے کچھ ایسے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا جن کے نتیجے میں یہ روز بروز مذہب سے دور ہوتی چلی گئی۔

واضح رہے کہ برِصغیر میں تحریکِ استخلاصِ وطن کے اوّلین داعی مسلمان تھے — تحریکِ شہیدینؒ جہاں احیائے اسلام کی ایک ہمہ گیر تحریک اور منظم کوشش تھی وہاں استخلاصِ وطن بھی اسکے مقاصد میں ایک اہم حیثیت رکھتا تھا۔ گویا اس میں دین اور سیاست کا وہ حسین امتزاج موجود تھا جو جاری تاریخ کے قرنِ اوّل کا طرۂ امتیاز ہے۔

حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے بعد بھی تقریباً ربع صدی تک آزادیٔ وطن کی کوششوں میں اسی تحریکِ شہیدینؒ کے باقیات الصالحات کی جلوہ آرائی نظر آتی ہے اور اسی کے متعلقین و متاثرین کہیں جیلوں میں تشدد اور بہیمیت کے شکار بنتے اور کہیں پھانسی کے تختوں کو زینت بخشتے نظر آتے ہیں۔

اس پورے عرصے میں آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں کوئی غیر مسلم نظر نہیں آتا! — وجہ ظاہر ہے۔ ہندوؤں کے لئے انگریز کی غلامی ایسی انوکھی بات نہ تھی اور ان کے لئے معاملہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی کا تھا — جبکہ مسلمان حال ہی میں مسندِ حکومت سے اتار کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے تھے لہٰذا یہ بالکل فطری بات تھی کہ آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی ابتدا بھی انہی کی طرف سے ہوتی!

۱۸۵۷ء کے معرکۂ آزادی وطن میں پہلی بار ہندوستان کے مسلمان اور غیر مسلم سب شانہ بشانہ اور دوش بدوش غیر ملکی استبداد کے خلاف برسرِ پیکار نظر آتے ہیں، اس جنگِ آزادی کی اس اہم خصوصیت کے علاوہ کہ اس میں ہندو اور مسلمان یکساں شریک ہوئے، اس کی دوسری اور اہم تر خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کے سیاسی و عسکری زعماء کے ساتھ ساتھ — بلکہ بعض مقامات پر ان سے بھی بڑھ کر دینی و مذہبی پیشواؤں نے حصہ لیا — اور علمائے کرام نے بھی سیف بدست اور سربکف ہو کر جان کی بازی لگائی۔

---

۱۸۵۷ء کے بعد تاریخ ایک بالکل نیا موڑ مڑ گئی! — اور کمپنی بہادر کی حکومت کے اختتام اور براہ راست تاج برطانیہ کے زیر انصرام آ جانے کے بعد ہندوستان میں حالات نے بالکل دوسرا رُخ اختیار کر لیا۔

ایک طرف انگریزی استعمار نے اپنے پنجے جسد ہند پر مضبوطی سے گاڑ لئے اور اس کا سیاسی و عسکری تسلط محکم ہو گیا — نتیجۃً ہندوستانی روز بروز نہتے اور عسکری اعتبار سے بے دست و پا ہوتے چلے گئے — چنانچہ آزادی کے لئے بھی بالکل غیر عسکری و خالص آئینی و سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوا۔

اور اس کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی غیر مسلم اقوام کی عددی فوقیت کے نتائج و عواقب کا ظہور شروع ہو گیا۔

دوسری طرف خود انگریز نے تلوار کے بجائے قلم سے حکومت شروع کی اور ہندوستانیوں کو ان کے اپنے ماضی سے منقطع، اپنے عقائد و افکار و نظریات سے دست بردار اور اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے علوم و فنون سے بیگانہ کر کے ایک نئے ہندوستان کی داغ بیل ڈالنی شروع کی — غیر ملکی حکمرانوں کے اس "ثقافتی انقلاب" کا استقبال ہندوؤں اور مسلمانوں کے جانب سے مختلف طرز پر ہوا — ہندو اپنے ماضی سے پہلے ہی بہت دُور نکل گئے تھے اور ان کا اپنے علوم و فنون اور اپنے تہذیب و تمدن سے کوئی گہرا رشتہ باقی نہ رہا تھا لہٰذا انہوں نے تقریباً یکسو اور متحد ہو کر نئے رجحانات کو خوش آمدید کہا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو ابھی اپنا شاندار ماضی پوری تابناکی کے ساتھ نظر آ رہا تھا — اور ان کے عقائد اور علوم و فنون ابھی ان کے قلوب و اذہان میں گہری جڑیں رکھتے تھے — لہٰذا ان کے ہاں ایک انتشار پیدا ہو گیا — مسلمانانِ ہند کے ان طبقوں نے جو دین و مذہب سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے، بدلتی ہوئی ہوا کے ساتھ اپنا رُخ تبدیل کرنے سے انکار کر دیا — اور وہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر گوشوں اور کونوں میں قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کے درس و تدریس میں منہمک ہو گئے — جب کہ ہندوستان کی مسلمان قوم کا سوادِ اعظم — "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی!" کے نظریے کو اپنا کر نئے حالات کے مطابق بدلتا چلا گیا۔

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی توانائیاں منتشر ہو گئیں اور مجموعی طور پر ہندوستان کی مسلمان قوم کی قوت و طاقت کو ضعف پہنچا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی طبقے اور قومی



قیادت میں بُعد پیدا ہو گیا جو بعد میں مسلسل بڑھتا چلا گیا اور اسے بجا طور پر دورِ جدید میں اسلامیانِ ہند کی قومی تحریک کی بدقسمتیوں کا سرآغاز کہا جا سکتا ہے!

---

ساتھ ہی مندرجہ بالا دو اسباب کی بنا پر — یعنی ایک اس وجہ سے کہ خالص آئینی جدوجہد میں اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ پیدا ہو گیا، اور دوسرے اس بنا پر کہ مسلمانوں کے مذہبی طبقات کے قوم کے سوادِ اعظم سے علیحدہ ہونے کی بنا پر ان کی مجموعی قوت میں کمی پیدا ہو گئی — ہندوستان میں غیر مسلموں کا پلڑا بھاری ہونا شروع ہوا۔

اس میں مزید اضافہ غیر ملکی حکومت کے جانب سے غیر مسلموں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کے ساتھ سرد مہری ہی نہیں بلکہ باقاعدہ ہمت شکنی کی کوششوں سے ہوا — غیر ملکی حکمرانوں کا یہ رویّہ بھی بلا وجہ نہ تھا۔ اوّلاً انہیں خوب معلوم تھا کہ انہوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی ہے اور اس تازہ زخم خوردہ قوم کی خاکستر میں ابھی ایسی چنگاریاں موجود ہیں جو کسی بھی وقت معمولی سی تحریک سے بھڑک سکتی ہیں — ثانیاً ہندو صرف ہندوستان میں تھے۔ جب کہ ہندوستانی مسلمان اس عالمگیر اسلامی برادری کا جزو تھے۔ جو کرۂ ارضی کے ایک بہت بڑے حصے میں ایک غالب اکثریت میں تھی اور ابھی تک اس کے قلوب فاصلوں کے بُعد اور حالات و مسائل کے فرق کے باوجود کچھ ایک ہی سے احساسات و جذبات سے معمور اور ایک ہی سے نشے سے مخمور تھے —! حتیٰ کہ صفحۂ ارضی کے بعید ترین گوشوں میں بسنے والے مسلمان ایک دوسرے کی تکالیف و مصائب پر ایسے تڑپ اٹھتے تھے جیسے خود ان ہی کے سینوں میں خنجر گھونپ دیا گیا ہو ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے مسلمانوں پر مغربی استعمار اس دور میں جو ستم ڈھا رہا تھا وہ اس کے کرب و الم کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے — اور اس کی بنا پر ان کے دلوں میں انگریز دشمنی کے جذبات کو مزید انگیخت مل رہی تھی۔

ہندوستان کا ہندو غیر ملکی حکمرانوں کی نگاہ میں کچھ زیادہ ہی بے ضرر اور مسکین تھا — چنانچہ ایک طرف خود اس نے نئے حکمرانوں کے ساتھ توافق و تعاون میں مسلمانوں پر پیش قدمی کی — اور

دوسری طرف حکمرانوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی — نتیجۃً انگریزی استعمار کے سائے میں ہندو امپیریلزم نے انگڑائیاں لینی شروع کیں — ہندوؤں میں اس قومی بیداری کے ساتھ ہی مسلمان دشمنی کے جذبات بھی جاگ اٹھے —! اور اس طرح ہندوستان میں ہندو مسلم کشمکش کے دورِ جدید کا آغاز ہو گیا —

یہ کشمکش ابتداء ہی سے بڑی شدید تھی، اور پوری ہندو قوم میں مسلمانوں کی تقریباً آٹھ سو سالہ غلامی کا ردِ عمل ایک دم پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا — مسلم قوم کے سوادِ اعظم نے اس ابھرتی ہوئی طاقت کے کچوکوں اور چڑھتے ہوئے سیلاب کے ریلوں کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ زندگی کے ہر میدان میں ہندوؤں نے منظم طریقے پر مسلمانوں پر عرصۂ حیات کو تنگ کرنے کی کوشش کی اور ان کے نفرت بھرے تعصب کا مظاہرہ ہر سمت ہونے لگا! — یہی نہیں بلکہ ہندو امپیریلزم کا یہ عفریت کچھ ایسے انداز اور جوش و خروش سے اٹھا کہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ وہ ہندوستان کی پوری مسلم قومیت کو نگل کر نیست و نابود نہ کر دے۔

یہ حالات تھے جن میں ہندوستان میں مسلم قوم پرستی کی تحریک نے قوت پکڑنی شروع کی، اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے قومی تشخص کے بقا کی فکر دامنگیر ہوئی۔

بدقسمتی سے اس موقع پر مسلمانانِ ہند کے مذہبی طبقوں اور خصوصاً تحریکِ شہیدینؒ اور جماعت مجاہدین کے معنوی و روحانی وارثوں نے حالات کے رخ کو سمجھنے میں سخت غلطی کی، اور وہ ہندوستان کی پوری مسلمان قوم کے سوادِ اعظم کے احساسات کا صحیح اندازہ کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا اصل سبب کیا تھا؛ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل سبب وہ حد سے بڑھی ہوئی انگریز دشمنی ہو۔ جو ان کے لاتے ہوئے زندقہ و الحاد — اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں پر ان کے بے پناہ مظالم سے پیدا ہوئی تھی — اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل سبب ان حضرات کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہو جس کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز سے بٹ لینے کے بعد ابنائے وطن کے مقابلے میں اپنے دین اور اپنے تہذیب و تمدن اور فی الجملہ اپنے قومی تشخص کا تحفظ کچھ مشکل نہ ہو گا —— بہر حال ہوا یہ کہ ان حضرات نے اپنے لئے یہ راہ متعین کی کہ پہلے ہندوؤں کے ساتھ مل کر غیر ملکی حکمرانوں سے گلو خلاصی کرائی جائے — ہندو مسلم معاملات اس کے بعد طے ہوتے رہیں گے! — جبکہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لئے یہ لائحہ عمل طے کیا کہ وہ پہلے ہی سے تحفظات کے حصول کی جدوجہد کریں گے — اور اس امر کی سعی کریں گے کہ وطن اس طور سے آزاد ہو کہ اس میں ان کے جملہ حقوق اور فی الجملہ ان کے قومی تشخص



کے تحفظ کی مکمل ضمانت حاصل ہو جائے۔

اس طرح ہندوستان کی مسلمان قوم کے سوادِ اعظم اور اس کے مذہبی طبقات کے مابین بُعد مزید بڑھ گیا — بلکہ آزادی کی جدوجہد میں یہ دونوں علیحدہ علیحدہ راہوں پر گامزن ہو گئے —! جوں جوں وقت گزرا یہ بُعد بڑھتا چلا گیا — اور بعد میں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے اس میں ضد اور ہٹ دھرمی کا عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا حتٰے کہ پھر شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں بھی رجالِ دین کی آنکھیں کھولنے میں ناکام رہیں —!

اس صورتِ حال کا سب سے اہم نتیجہ جو نکلا۔ جس کی جانب بہت کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک قوم کے بہترین افراد سے محروم ہو گئی۔ اب تک قوم کی پوری سیاسی و دینی قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں رہی تھی اور جس میں ایک سے ایک بڑھ کر مخلص و بے نفس، محنتی و سخت کوش، آزمودہ و تجربہ کار اور ہر اعتبار سے منجھا ہوا اور سرد و گرم چشیدہ سیاسی کارکن موجود تھا وہ قوم سے بے تعلق ہو کر رہ گیا — اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج خطۂ پاکستان میں ہماری قومی زندگی جس شدید قحط الرجال سے دوچار ہے اس کا اصل سبب یہی نہیں ہے!

---

ہندوستانی مسلمانوں کی قومی سیاست مذہب سے جس تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی اگر یہ بُعد اسی طرح بڑھتا رہتا تو بات نہ معلوم کہاں تک جا پہنچتی لیکن اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہوا کہ اس دور میں چند شخصیتیں ایسی بھی اُبھریں جنہوں نے اس بُعد کو کم کرنے کی کوشش کی — اور اس میں انہیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

ان شخصیتوں میں سرِ فہرست علامہ اقبال کا نام ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی قومی تحریک میں مذہبی جذبے اور رنگ کی آمیزش کی جو کامیاب کوشش کی وہ ظاہر و باہر ہے — لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ 'مذہبی' آدمی ہرگز نہ تھے، لہٰذا ان کی کوششوں سے قومی تحریک میں کم از کم وقتی طور پر مذہبی روح تو ایک حد تک پیدا ہو گئی لیکن 'مذہبی طبقوں' سے اس کا بُعد کسی طرح کم نہ ہوا —

علامہ کے ساتھ ہی ایک دوسری عظیم شخصیت جس نے ایک بار حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ لگا کر اُمتِ مسلمہ کی "عمرِ رفتہ" کو آواز دی — اور 'امام الہند' کا خطاب پایا وہ مولانا ابوالکلام مرحوم کی تھی۔ — انہوں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کی ولولہ انگیز دعوت کے ذریعے ایک بار اسلامیانِ ہند کے دل میں پھر سے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی — لیکن وہ غالباً خود اپنی شخصیت کو احیائے

دین کی ہمہ گیر کوشش کے لئے غیر موزوں جان کر جلد ہی —— جبکہ ابھی ان کی زور دار دعوت کی صدائے بازگشت خود ان کے اپنے کانوں تک بھی نہ پہنچ پائی تھی، اس کام سے دست بردار ہو گئے —— تاہم ان کی دعوت سے بھی وقتی طور پر ایک دینی جذبہ ہندوستان کی پوری مسلم قوم میں تازہ ہو گیا۔

امام الہند کی دعوت کی گھن گرج کچھ کم ہوئی ہی تھی کہ ایک تیسری شخصیت جسے ان ہی کی شخصیت کا معنوی تسلسل قرار دیا جا سکتا ہے انہیں ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کے عزائم کے ساتھ سامنے آئی —— یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے!۔ جو اگرچہ معروف 'مذہبی حلقوں' سے تو متعلق نہ تھے لیکن ان کی "مذہبیت" بہرحال مسلم تھی: انہوں نے ایک طرف ان 'مذہبی حلقوں' پر شدید تنقید کی جو ہندوستان کی اکثریت کے عزائم سے بے خبر، آزادی کی محبت اور انگریز دشمنی کے جذبے سے مغلوب ہو کر ایسی راہ پر چل پڑے تھے۔ جس کا نتیجہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا قیام اور اس میں مسلمانوں کی قومیت کا کلی انضمام تھا ——! اس طرح ان کے قلم نے گویا پہلی بار مسلمانانِ ہند کے سوادِ اعظم کے دلی احساسات کی ترجمانی مدلل و مفصل طور پر کی! چنانچہ قوم نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا —— دوسری طرف انہوں نے اپنے مخصوص کلامی انداز میں ہندوستان کے مسلمانوں کو دین کی طرف متوجہ کیا، اور مغرب کے ملحدانہ نظریات و افکار کا پر زور ابطال کر کے اسلام کی حقانیت اور خصوصاً اس کے ایک مکمل اور بہترین نظامِ حیات ہونے کو واضح کیا —— چنانچہ ان کی کوششوں سے ایک بڑی تعداد میں مسلمان نوجوان خصوصاً وہ جو انگریزی تعلیم یافتہ اور اس سے پہلے مغربی تہذیب و تمدن کے دلدادہ تھے۔ دین کی جانب راغب ہوئے —— اور ایک بار پھر یہ امید بندھی کہ ہندوستان کی مسلم قومیت اور اسلام کا رشتہ از سرِ نو استوار اور مضبوط و محکم ہو جائے گا۔

لیکن جلد ہی یہ امید منقطع ہو گئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تحریک دوسرے بڑے حادثے سے دوچار ہو گئی —— یعنی مولانا مودودی مسلمانوں کی قومی تحریک سے علیحدگی اختیار کر کے ہندوستان کی مسلمان قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ گئے اور ایک دوسری راہ پر گامزن ہو گئے اپنے رخ کی اس تبدیلی کی جو دو بڑی وجوہات مولانا نے بیان فرمائیں وہ انہی کے الفاظ میں سنئے!

"پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دور میں عامہ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لئے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اس قدرِ قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے



میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا میرے نزدیک یہ صورتِ حال اسلام کے لئے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ جیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی۔ تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کمبخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رُل مل جائے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس تحریک کے اندر داعیہ دینی کے بجائے داعیہ قومی کو بہت زیادہ کارفرما دیکھا اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جز اتنا کم اور قوم پرستانہ جز اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولتمند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں۔ اس حدِ کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے"۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ دیباچہ)

اگرچہ بہت سے لوگوں کے نزدیک مولانا مودودی کی مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد سے کنارہ کشی کا اصل سبب بالکل ذاتی تھا چنانچہ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے متذکرہ صدر کالم نویس صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"مولانا نے تحریکِ پاکستان سے اپنی کنارہ کشی کا کبھی کوئی سبب بیان نہیں فرمایا؛ لیکن اس کی وجہ بہرحال تھی اور بادنیٰ تامل جو بات معلوم ہو جاتی وہ یہ ہے کہ مولانا نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا پرچار اس امید میں کیا تھا کہ وہ اپنی قیادت انہی کو سونپ دیں گے لیکن جب یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں نے جس شخص کی صدا پر کان دھرا۔ وہ بجائے ان کے قائدِ اعظم تھے تو انہوں نے فوراً اس پورے نقشۂ کار ہی کو تج دیا ...... وگویا، مولانا مودودی کی غداری کا

اصل سبب خالص ذاتی تھا۔ ؟

لیکن اس وقت ہم اس بحث میں الجھنے کو سعیِ لاحاصل سمجھتے ہیں، بلکہ ہمارے نزدیک مولانا نے ۱۹۴۱ء میں مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک سے کٹ کر اپنے لئے جو کام تجویز کیا۔ یعنی قومی سطح سے بلند اور گروہی مفادات سے بالا ہو کر خالصۃً اللہ کے دین کی دعوت اور تبلیغ و اشاعت اور وہ بھی خالص علمی و فکری انداز میں — وہ یقیناً قومی جدوجہد کے مقابلے میں بہت اعلیٰ و ارفع تھا —

تاہم قومی جدوجہد کے نقطۂ نظر سے مولانا مودودی کے رُخ کی یہ تبدیلی سخت نقصان دہ ثابت ہوئی اس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کے اسلام سے حقیقی و معنوی بُعد میں مزید اضافہ ہو گیا — بلکہ طبقۂ متوسط کے نہایت مخلص اور سرگرم کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی قومی جدوجہد سے لاتعلق ہو گئی —

---

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کا عرصہ ہندوستانی سیاست میں حالات و واقعات کی انتہائی تیز رفتاری کا دور ہے، دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک طرف خود انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ اب زیادہ دیر تک ہندوستان پر اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس کے جھنڈے تلے ہندوؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے جدوجہدِ آزادی کو تیز تر کر دیا اور تیسری طرف مسلمانانِ ہند کا سوادِ اعظم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں مشغول ہو گیا۔

اس جدوجہد کے آخری زمانے میں جبکہ مسلم لیگ کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بالکل واضح اور مبرہن کر دے کہ وہ اسلامیانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور پوری مسلمان قوم یکسوئی کے ساتھ اس کے جھنڈے تلے جمع ہے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے دینی جذبات کو اپیل کرتی اور اسلام سے ان کی محبت اور دلی تعلق کو کام میں لاتی — چنانچہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں پورا ہندوستان "پاکستان کا مطلب کیا — لا الٰہ الا اللہ!" کے نعروں سے گونج اٹھا — اور اسلامی حکومت، اسلام کے اصولِ مساوات و اخوت — اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی، اسلامی تہذیب و تمدن — اور اسلامی قانون و دستور کی اصطلاحات کا استعمال مسلم لیگ کے رہنماؤں کی تقریروں میں عام ہو گیا۔ گویا اس دور میں تحریکِ مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف قومی مفادات کی محافظ ہی نہیں بلکہ دین کے ساتھ ان کی محبت اور اسلام کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کا مظہر بھی بن گئی۔ چنانچہ پوری قوم مجتمع ہو کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور خود مذہبی طبقات میں سے بھی



کچھ لوگ اس کی امداد کے لیے میدان میں نکل آئے۔

تاہم یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ تحریکِ مسلم لیگ کا وہ دور تھا جس میں کسی تحریک کے واقعی نظریات اور حقیقی افکار کے بجائے خوش آئند جذبات اور نیک خواہشات کی عملداری ہوتی ہے۔ اس دور کی کہی سنی باتوں پر کسی مستحکم تعمیر کا خیال باندھنا ایک بچگانہ خواہش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

خود مولانا مودودی اس دور میں قومی زندگی کی منجدھار سے دور بیٹھے عمرانیات کے ان اٹل اصولوں کا درس دیتے رہے کہ:

"حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو، مصنوعی طریقے سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر ادھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اخلاق، نفسیات، تمدن اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے اس کے کچھ ابتدائی لوازم، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے یہ وجود میں آتی ہے ......"

"..... اس خام خیالی کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے، جس کا نام "اسلامی حکومت" ہے مگر خالص علمی طریقے پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے؟"

......... "بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے[1] پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں ...."

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم: اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟)

اور پھر جوں جوں قومی تحریک زور پکڑتی اور پوری مسلمان قوم کو اپنے دامن میں سمیٹتی چلی گئی۔ ان کی تنقیدیں بھی تلخ تر ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ ان میں نفرت و حقارت کی آمیزش بھی ہو گئی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۷ء میں ٹونک میں انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں یہ فرما دیا کہ:

"اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی"

---

[1] یعنی یہ امید کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہوگا۔

اور "یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کیلئے کھڑے ہوجائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے......"

سارے ہندوستان کا پاکستان بننا تو تقدیر الٰہی میں نہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم ہی سے ہوا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان جیسا کچھ بھی ہے عالم وجود میں آگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام عمرانیات اور سیاسیات کے طالب علموں کے لئے ایک معجزہ سے کسی طرح کم نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک میں ابھی ہرگز اتنی قوت اور بل بوتہ نہ تھا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی صورت میں ہندو امپریلزم کے چنگھاڑتے ہوئے عزیمت کی خواہشات کے علی الرغم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے —— کچھ لوگ اس میں انگریزوں کی سیاست کا دخل گردانتے ہیں لیکن کبھی ابتدائی دور میں چاہے تحریک مسلم لیگ پر کسی انگریز گورنر جنرل یا وائسرائے کی نظر کرم رہی ہو یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے کہ آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل —— اور خصوصاً برطانیہ میں لیبر پارٹی کے برسر اقتدار آجانے کے بعد انگریزی حکومت کا رویہ مسلم لیگ کے ساتھ واضح طور پر معاندانہ رہا —— اور ہندوستان کے آخری انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بارے میں تو سب کو یہ معلوم ہے کہ وہ کانگریس کے علانیہ طرف دار اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔

بنا بریں اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کا قیام اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی مشیت تھی جو ہندوؤں اور انگریزوں کی متفقہ مخالفت کے علی الرغم پوری ہوئی تو اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے!

---

ہم نے اسلامیانِ ہند کی تقریباً سوا سو سالہ تاریخ کے ان چند اہم نقوش کو صفحۂ قرطاس پر اس لئے منتقل کیا ہے کہ تحریک پاکستان کا صحیح پس منظر نگاہوں کے سامنے آجائے اور صورت واقعہ جیسی کچھ کہ فی الحقیقت ہے ظاہر ہوجائے، اس لئے کہ صحیح طرز عمل اور درست سمت میں اقدام کا تمام تر انحصار اسی پر ہے —— نیک خواہشات کی علمداری بسا اوقات انسان کے نقطۂ نظر کو غلط کر کے رکھ دیتی ہے اور میدان سیاست میں اترنے کے بعد بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک غلط موقف جو ابتدا میں محض "حکمت عملی" کے تحت اختیار کیا جاتا ہے۔ بعد میں جماعتوں اور تحریکوں کے اپنے نقطۂ نظر میں مستقل طور پر ایسی کجی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے جو پھر اس کے گلے کا ہار بن جاتی ہے اور کسی طور سے پیچھا نہیں چھوڑتی —— نتیجۃً بالکل مخالف سمت میں سفر کے باوجود یہ توقع برقرار رکھی جاتی ہے کہ بس



ع "اس موڑ کے آگے منزل ہے مایوس نہ ہو وا ماندہ سب!"

آئندہ صحبت میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہم قیام پاکستان کے بعد کے بیس سالوں کا جائزہ اسی نقطۂ نظر سے لیں گے —— اور پھر ہمارے نزدیک اسلام اور پاکستان دونوں کے ساتھ خلوص اور خیر خواہی کا تعلق رکھنے والے لوگوں کو جو طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے اسے بیان کریں گے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

## ۲

اواخر ۱۹۶۵ء میں یہ خیال عام تھا کہ ایبڈو کی پابندیاں ختم ہونے کی بنا پر نئے سال سے پاکستان کی سیاسی زندگی میں گہما گہمی شروع ہوجائے گی۔ لیکن دو ماہ بیت گئے اور نظر یہ آرہا ہے کہ معاملہ وہی ہے کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

اکثر و بیشتر لیڈران کرام نے 'آزاد' ہونے کے بعد سیاست کے میدان میں 'رومانیت' پر 'حقیقت پسندی' ہی کو ترجیح دی ہے۔ صرف چند ایک کا مسئلہ باقی ہے لیکن نظر یہی آرہا ہے کہ پاکستان میں احزاب مخالف کا حال جو پہلے رہا ہے وہی اب بھی رہیگا۔

عہد جدید کی جمہوریت میں ایک صحت مند حزب مخالف کا وجود بالکل ناگزیر ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں یہ شے عنقا ہی رہی ہے۔ کاش کہ کچھ لوگ ہمت کر کے میدان میں آئیں اور صحت مند بنیادوں پر سیاسی زندگی کا آغاز کریں۔

'بیمار سیاست' کے البتہ دو مظاہرے ان دو ماہ میں ہوتے ہیں۔ ایک میں مذہبی طبقوں کے عدم اطمینان نے ظہور و خروج کیا —— اور دوسرے میں عوام کی معاشی مشکلات سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی سعی ناکام ہوئی۔ ہماری مراد ہنگامۂ عید —— اور ریلوے کی سٹرائک سے ہے! ادھر کچھ ہل چل طلبہ کے حلقے میں بھی محسوس ہو رہی ہے!

ہمارے نزدیک اس نوعیت کی چیزیں سیاست میں ہیجان ذہن کی کارفرمائی سے پیدا ہوتی ہیں۔ عید کے مسئلے پر ہم نے گذشتہ شمارے میں اشاعت کے لئے اپنے کچھ خیالات کو قلمبند کیا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس تحریر کو عین وقت پر روک لینا پڑا —— اب یہ واقعہ تو اگرچہ پرانا ہوچکا ہے تاہم چونکہ اس پر اظہار خیال کا سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے لہٰذا ہم اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے لئے اسی تحریر کو معمولی ترمیم کے ساتھ اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔

ریویو کی سٹرائک اور اس قبیل کی دوسری سرگرمیاں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پاکستان میں بسنے والے لوگوں میں ابھی تک مشترک قومی مفاد کا تصور پیدا نہیں ہو سکا ہے اور گروہی مفادات و طبقاتی مسائل سے بلند ہو کر ملی و قومی سطح پر سوچ بچار کی عادت ابھی ہمیں نہیں پڑی۔ اسی بنا پر بعض اوقات اچھے بھلے مخلص اور ملک و قوم کے خیرخواہ بھی ایسی سرگرمیوں میں ناواقفیت ملوث ہو جاتے ہیں جو تعمیری کم اور تخریبی زیادہ ہوتی ہیں۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں کراچی میں "طلبا کے مسائل" کا محدود تصور بھی اسی طرح ایک سخت ناخوشگوار صورت حال پیدا کرنے کا سبب بن گیا تھا۔ راقم الحروف اس زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا ناظم اعلیٰ تھا۔ کراچی میں کچھ لوگوں نے "طلبہ کے مسائل" "STUDENTS' CAUSE" کا نعرہ لگایا۔ جمعیت کی مقامی قیادت نے غالباً "حکمت عملی" سے کام لیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اپنا سر بھی اس راگنی میں شریک کر دیا۔ بلکہ کوشش کی کہ طلبہ میں "انقلاب قیادت" کے اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ جمعیت کراچی کے آرگن (STUDENTS VOICE) نے کچھ زیادہ ہی زور شور سے طلبہ کے مسائل کا رونا رویا اور اس میں کمیونسٹ طلبہ سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن ہوا یہ کہ جب طلبہ کا ایجی ٹیشن عروج کو پہنچا تو صورت حال قائدینِ جمعیت کے کنٹرول سے باہر ہو گئی اور کچھ انتشار پسند کمیونسٹ طلبہ نے صورت حال کو سخت ہنگامہ خیز اور اشتعال انگیز بنا کر رکھ دیا —

راقم الحروف لاہور میں دور بیٹھا اس صورت حال پر مضطرب ہوتا رہا اور طلبہ کی تنظیموں کا نظم و ڈسپلن جس طرح کا ہوتا ہے اور جس طرح کے محدود وسائل و ذرائع کے ساتھ وہ کام کرتی ہیں۔ اس کے پیش نظر کراچی کی صورت حال کو تو بگڑنے سے نہ روک سکا لیکن جب اس کی صدائے بازگشت سابق پنجاب میں سنائی دی تو اس وقت کے طالب علم ساتھیوں کو اب بھی یاد ہو گا کہ یہاں راقم الحروف نے ایک سخت موقف کے ساتھ صورت حال کو بگڑنے سے روکنے کی پوری کوشش کی اور بحمد اللہ اس میں اسے کامیابی بھی ہوئی —

نومبر سنہ ۱۹۵۲ء میں کراچی میں اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع ہوا تو اس میں راقم الحروف نے "طلبا کے مسائل اور ان کا حل" کے عنوان ہی سے تقریر کی جس کی دو اقساط "عزم" لاہور میں شائع ہو گئی تھیں لیکن ایک حصہ ابھی باقی تھا کہ عزم کی اشاعت ہی بند ہو گئی (رفیق محترم خواجہ محبوب الٰہی صاحب نے بنگال میں البتہ اس کا مکمل ترجمہ ایک پمفلٹ کی صورت میں ڈھاکہ سے شائع کر دیا تھا) —

اس اشاعت میں اس تقریر کو تقریباً من و عن شائع کیا جا رہا ہے اور اس سے مقصود یہ



ہے کہ پاکستان کے نوجوان طلبہ خصوصاً وہ جو یہاں اسلام کے مستقبل سے مخلصانہ تعلق رکھتے ہوں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اپنے موجودہ طرز عمل کا تنقیدی جائزہ لیں — شاید اس میں انہیں کچھ قابل غور باتیں نظر آجائیں۔

طلبہ چونکہ ملی و ملکی — اور دینی و مذہبی دونوں اعتبار سے ہمارا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہیں اور ہمارا مستقبل بہر صورت انہی سے وابستہ ہے لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرز فکر کی تصحیح بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آئندہ سے "میثاق" انشاء اللہ طلبہ سے رابطہ و تعلق مستقلاً استوار رکھے گا چنانچہ آئندہ شمارے ہی میں مولانا امین احسن اصلاحی کی وہ تقریر شائع ہو گی جو انہوں نے حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے اساتذہ اور طلبہ کے ایک اجتماع میں کی ہے۔

ساتھ ہی اس ملک میں نظام تعلیم میں اسلامی روح پیدا کرنے کی غرض سے جو کوششیں ہو رہی ہیں اور تجربات کئے جا رہے ہیں۔ "میثاق" انشاء اللہ ان سے بھی رابطہ رکھے گا اور اس سلسلہ میں مولانا عبد الجبار غازی کی رہنمائی میں "مجلس تعلیمات اسلامیہ" جو گراں قدر خدمات سرانجام دے رہی ہے ان سے قارئین کو باخبر رکھے گا!

ادھر "مجلس تعلیمات اسلامیہ" کی ایک نشست میں راقم الحروف کو بھی شرکت کا موقع ملا اس میں محترم ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے ایک مقالہ پیش کیا اور ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر زور دیا معلوم ہوا کہ اس سے قبل کئی خیال انگیز مقالات ان نشستوں میں پڑھے جا چکے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ اس مجلس میں پیش ہونے والے منتخب مقالات کو نذر قارئین کرتے رہیں۔

### لاہور میں "میثاق"

مندرجہ ذیل سٹالوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے

| | |
|---|---|
| * کاشانۂ ادب، نزد گنبد کچہری روڈ، پرانی انارکلی | * ماڈل بکسٹال، نو تنشن مارکیٹ، مال روڈ |
| * ایم اسماعیل بکسٹال، چوک لوہاری | * پاک بک سٹال، نو تنشن مارکیٹ، دہلی مال |
| * نیشنل بک سٹال، چوک لوہاری | * القلم بک سٹال، نیلا گنبد روڈ |
| * مکتبۂ پاکستان، چوک لوہاری | * ادبستان، چوک گلشن، میکلوڈ روڈ |
| * ایم شمس الدین تاجر کتب نادرہ، نزد مسلم مسجد | * کاسمک بکسٹال، ۳۰/۳ دہلی مال |
| * شرافت نیوز ایجنسی، پرانی انارکلی نزد تھانہ | * وڈس ورتھ ایجنسی معرفت ایم سی اے ادبی مال — اور |
| * معین نیوز ایجنسی، معین بازار کرشن نگر | ریلوے سٹیشن کے تمام بک سٹال |

## بقیہ :۔ ملکوت الٰہی پر شہادت صفحہ ۱۲ سے آگے

ان کے ارادوں پر مجتمع ہو جائیں اور ان کے ارادے عمومی مصالح پر مرکوز ہو جائیں۔ اس لئے ان کے اندر اختلاف اور تصادم مناسب نہیں۔ اختلاف و تصادم نہ ہونے کی شکل یہی ہے یہ ممکن ہے کہ ان کے مصالح بروئے کار آئیں۔ ان کی قوت میں اضافہ ہو۔ ان کی آزادی برقرار رہے۔ ان کا بول بالا ہو، ان کے اخلاق مہذب ہوں اور ان کی برکت میں وسعت ہو تاکہ ان کا وجود مخلوقات کے لئے رحمت اور روئے زمین پر برکت کی حیثیت حاصل کرے۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اپنے اندر موافقت اور وحدت پیدا کرنے میں پوری کوشش صرف کر دیں۔ یہی ان کا نصب العین اور ان کے حوصلوں کا مرکز قرار دیا جائے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی سب سے اعلیٰ اور برتر چیز یعنی حریت اور خودداری بھی اس پر بیچ دیں۔ اگر خلافت کے اندر وہ بھلائیاں نہ ہوتیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے تو کوئی باعزت آدمی اس کے لئے اپنی آزادی کی قیمت ادا نہ کر سکتا۔ لیکن لوگ یہ قیمت ادا کرتے ہیں۔ اور اپنے سے زیادہ افضل اور عمر یان شخص کی سمع وطاعت کا معاہدہ کرتے ہیں اور اسلام کی تعلیم ہے بھی یہی۔ اسلام حقیقت میں معاہدہ ہے اللہ کی اطاعت کا، ان قوانین کی تعمیل کا جو اس نے بھیجے اور ان حکمرانوں کی اطاعت کا جو ان قوانین کو نافذ کرتے ہیں جب لوگ سمع وطاعت کا معاہدہ کر لیتے ہیں تو گویا انہوں نے اپنی آزادی اس پر قربان کر دی۔ اللہ تعالیٰ اس قربانی کو قبول فرماتا ہے اور اس کے ثمرات کئی گنا بڑھا کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جب اپنی آزادی کی قربانی دے دیتے ہیں تو وہ اس کو تلف نہیں کرتے بلکہ دراصل اس کی حفاظت ہی کا اہتمام کرتے ہیں۔ جس طرح ایک آدمی اپنے خزانے رکھنے کے لئے ایک مضبوط محل بناتا ہے تو اسے ابتدا میں اپنا مال صرف کرنا پڑتا ہے تاکہ باقی مال محفوظ ہو سکے۔ اسی طرح جب ایک قوم ایک عادل امام چن لیتی ہے تو وہ دوسرے جباروں کی دست درازی سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتی ہے۔ اور ایسا کرنے کا بجز سمع وطاعت کے معاہدہ کے کوئی طریقہ نہیں اور اس معاہدہ کی بنیاد صدق پر ہوتی ہے۔


### کراچی میں "میثاق"

مندرجہ ذیل مقامات سے دستیاب ہو سکتا ہے :-

★ عوامی کتب خانہ نزد بولٹن مارکیٹ کراچی ۲ ——

★ —— طاہر بک ڈپو، ٹرام جنکشن، صدر کراچی




تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

# سورۂ نساء

یہ سورہ اپنی ماسبق سورہ — آل عمران — کے بعد اس طرح شروع ہوئی ہے کہ اس نے آل عمران کے تتمہ و تکملہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس اہم مضمون پر آل عمران ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس سورہ کی تمہید استوار ہوئی ہے۔ آل عمران کے خاتمے اور نساء کے آغاز نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آل عمران کی آخری آیت یاایھا الذین آمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون ہے۔ جس میں مسلمانوں کے لئے فوز و فلاح کی راہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ثابت قدمی دکھائیں، آپس میں جڑے رہیں، دشمن کے مقابل میں ڈٹے رہیں اور خدا سے ڈرتے رہیں۔ اب اس سورہ کو دیکھئے تو اسی 'اتقوا اللہ' کے مضمون سے شروع ہوئی ہے (یاایھا الناس اتقوا ربکم) اور آگے آپس میں جڑے رہنے اور مخالفین کے بالمقابل ثابت قدمی کے لئے جو ہدایات درکار تھیں وہ نہایت وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔[1]

ثابت قدمی اور وہ بھی اجتماعی ثابت قدمی بغیر مضبوط جماعتی اتصال کے ممکن نہیں ہے اور جماعتی اتصال کوئی اتفاق سے پیدا ہو جانے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بنیاد کا بھی محتاج ہے، مثبت تدابیر کا بھی متقاضی ہے اور ان فتنوں سے اس کو محفوظ رکھنے کی بھی ضرورت ہے جو اس کو درہم برہم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سورہ میں وہ ساری چیزیں بیان ہوئیں جو اسلامی معاشرہ کو مستحکم رکھنے اور اس کو انتشار سے بچانے کے لیے ضروری ہیں۔

اس سورہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا آغاز اس حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اس عقیدے پر قائم ہے کہ مرد اور عورت سب کا خالق اللہ وحدہ لاشریک ہی ہے۔ اسی نے سب کو ایک آدم سے وجود بخشا ہے۔ اس وجہ سے خدا اور رحم سب کے درمیان مشترک ہیں۔ اس کے بعد معاشرے کے سب سے زیادہ کمزور عناصر یتیموں اور عورتوں کے حقوق معین فرمائے ہیں اور ان کو ادا کرنے پر زور دیا ہے اور اسی تعلق سے وراثت کی تقسیم سے متعلق قانون کی وضاحت فرمائی ہے۔ پھر مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض پر زور دیتے ہوئے اللہ، رسول اور اولوالامر کی اطاعت پر سب کو مجتمع و متفق رہنے کی تاکید فرمائی۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ منافقین

[1] سابق اور لاحق سورہ میں ربط کی یہ صورت صرف انہی دو سورتوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد نہایت لطیف مثالیں موجود ہیں جو آگے آئیں گی

کی قلعی کھولی ہے جو اسلامی معاشرے کے اندر ناسور کی حیثیت رکھتے تھے اور مسلمانوں کے اندر ان کے دشمنوں — یہود و نصاریٰ — کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اس روشنی میں غور کیجئے تو اس سورہ میں گویا اس ارتباط باہمی کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں جس کی ہدایت پر سابق سورہ ختم ہوئی تھی۔

## سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ کے عمود اور ماسبق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق کی طرف ایک اجمالی اشارہ تھا۔ اب ہم اس کے مطالب کا تجزیہ بھی کئے دیتے ہیں تاکہ پوری سورہ کے مضامین سرسری طور پر نگاہ کے سامنے آجائیں۔

[۱—۶] اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت جس نے سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ تمام مرد اور تمام عورتیں ایک ہی آدم و حوا سے وجود میں آئے ہیں اس وجہ سے خدا اور رشتۂ رحم سب کے درمیان رشتۂ جامعہ ہے۔ اس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ سب خدا سے ڈرتے رہیں اور سب رشتۂ رحم کا احترام محفوظ رکھیں۔ انہی دو بنیادوں پر اسلامی معاشرہ کی عمارت قائم ہے۔

یتیموں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید اور اس بات کی ممانعت کہ زور آور سرپرست اپنے رشتہ دار یتیموں کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلنے یا اس کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کو ہڑپ کرنے کی تدبیریں کریں۔ یتیموں کے حقوق کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ان کی ماؤں سے نکاح کی اجازت اور اس کے لئے تعدد ازواج کی رخصت چار تک کی قید، عدل اور ادائے مہر کے شرائط کے ساتھ۔

سرپرستوں کو اس بات کی ہدایت کہ وہ اس وقت تک یتیموں کے مال و جائداد کو ان کے حوالہ نہ کریں جب تک ان کے اندر معاملات کی سوجھ بوجھ نہ پیدا ہو جائے لیکن اس دوران میں ان کی ضروریات اور ان کی دلداری کا پورا خیال رکھیں۔ جب ان میں معاملات کی سوجھ بوجھ پیدا ہو جائے تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اس تولیت کے دوران میں اگر کوئی سرپرست غریب ہو تو یتیم کے مال میں سے بالمعروف لے سکتا ہے لیکن اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یتیم کے بڑے ہو جانے کے اندیشے سے اس کے بڑے ہونے سے پہلے ہی اس کی ساری املاک و جائداد کو ٹھکانے لگا دینے کی کوشش کرے۔

[۷—۱۴] تقسیم وراثت کے ضابطے کی تفصیل تاکہ ضعیف و قوی سب کے حقوق معین ہو جائیں اور معاشرے میں ظلم و حق تلفی اور نزاع و مخاصمت کے دروازے بند ہو جائیں۔

[۱۵—۱۸] معاشرے کو فواحش سے پاک رکھنے کے لئے ایک ابتدائی حکم اور اس کے تعلق سے اس امر کی تصریح کہ کن لوگوں کی توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوتی ہے، کن کی نہیں قبول ہوتی؟



[۱۹—۲۱] اس امر کا بیان کہ عورت مال وراثت نہیں ہے کہ باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملے۔ عورتوں سے اپنا دیا ہوا مال واپس لینے کے لئے ان کو تنگ نہ کیا جائے۔ اگر کوئی شخص ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو محض مال اینٹھنے کے لئے اس کو تہمت اور بہتان کا ہدف نہ بنائے۔

[۲۲—۲۵] باپ کی منکوحہ کے ساتھ بیٹے کے لئے نکاح کی ممانعت اور ان تمام عورتوں کی تفصیل جن کے ساتھ نکاح ناجائز ہے نیز شرائط نکاح کا بیان تاکہ معاشرہ بدکاری و بے حیائی اور ظلم و زیادتی کے مفاسد سے پاک رہے۔ جو لوگ آزاد عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے تھے ان کو مسلمان لونڈیوں سے نکاح کی بعض شرائط کے ساتھ اجازت اور قید نکاح میں آجانے کے بعد اگر ان لونڈیوں سے بدکاری کا صدور ہو تو ان کے لئے تعزیر کا ضابطہ۔

[۲۶—۲۸] مسلمانوں کو آگاہی کہ اللہ تعالیٰ ان احکام و ہدایات کے ذریعے سے تمہاری رہنمائی ایمان و عمل صالح اور توبہ و اصلاح کی اس شاہراہ کی طرف فرما رہا ہے جس کو اس نے ہمیشہ سے اپنے صالح بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے اور ان احکام و ہدایات میں اس نے اس سہولت کو بھی محفوظ رکھا ہے جو لوگوں کی طبعی کمزوری کے پیش نظر ضروری تھی تو خبردار ان نفس پرستوں کے ورغلانے میں نہ آجانا جو تمہیں پاکیزگی کی اس شاہراہ سے ہٹا کر شہوات کی وادیوں میں بھٹکا دینے کے لئے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔

[۲۹—۳۱] مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مال ناجائز ذرائع سے کھانے اور ایک دوسرے کا خون بہانے کی ممانعت۔ خدا رحیم ہے اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحیم ہوں۔ جو لوگ معاشرے میں ظلم و عدوان کی تخم ریزی کریں گے وہ سب جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ البتہ جو لوگ بڑے گناہوں سے بچتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے چھوٹے گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔

[۳۲—۳۳] شریعت میں عورت اور مرد دونوں کے لئے جو حدود و حقوق معین کر دیئے گئے ہیں سب اس کے اندر ہیں۔ اپنے اپنے حدود کے اندر ہر ایک خدا کے ہاں اپنی محنت کا اجر پائے گا اس لئے ایک دوسرے کی ریس اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ خدا نے حقوق بھی معین فرما دئے ہیں اور فرائض بھی اور وہ سب کو دیکھ رہا ہے۔

[۳۴—۳۵] خاندان اور معاشرے میں سربراہی اور قوامیت کا مقام مرد کو حاصل ہے یعنی طبعی

صفات اور کفالتی ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہی اس کے لئے موزوں ہے۔ نیک بیبیاں اس حق کا احترام کرتی ہیں۔ جن عورتوں سے سرکشی کا اندیشہ ہو ان کو ان کے شوہر نصیحت کریں اور اگر ضرورت محسوس کریں تو ایک حد مناسب تک ان کو تنبیہ بھی کر سکتے ہیں اور اگر محسوس ہو کہ فریقین کے اختلاف کی نوعیت کچھ شدید ہے تو اس کے لئے یہ تدبیر اختیار کی جائے کہ میاں اور بیوی دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک آدمی کو پنچ مقرر کر دیا جائے، جو حالات کی اصلاح کی کوشش کریں۔

[۳۶—۴۰] خدا، والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین، پڑوسی دو عام اس سے کہ قرابت مند ہو یا غیر قرابت مند، مستقل ہو یا عارضی اور وقتی، مسافر اور غلام، سب کے حقوق پہچاننے اور ادا کرنے کی تاکید۔ خدا کو وہی بندے پسند ہیں جو متواضع اور نرم مزاج ہوں، وہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اکڑنے والے، فخر کرنے والے، بخیل اور بخل کا مشورہ دینے والے ہوں جو اول تو ادائے حقوق میں خرچ ہی نہ کریں اور اگر خرچ کریں تو محض ریا و نمائش کے لئے۔ ادائے حقوق اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے گھاٹے میں رہنے والے نہیں۔ ان کے لئے خدا کے ہاں بڑا اجر ہے۔

[۴۱—۴۲] ان لوگوں کے حال پر اظہار افسوس جو آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر اڑے ہوتے تھے اور ایمان و عمل صالح کی اس صحیح راہ کو نہ خود اختیار کرتے تھے اور نہ دوسروں کو اختیار کرنے دینا چاہتے تھے۔

[۴۳—۴۵] مسلمانوں کو تنبیہ کہ یہود مختلف قسم کے فتنے اٹھا کر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ تمہیں اللہ کی شریعت اور اس کے پیغمبرؐ سے بدگمان کریں تاکہ جس طرح وہ اس صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں تم بھی اس سے بھٹک جاؤ۔ اسی مقصد سے انہوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ بھلا وہ دین بھی کوئی خدائی دین ہو سکتا ہے جس میں یہ تک اجازت ہے کہ ایک شخص قضائے حاجت اور مباشرت کے بعد بھی اگر پانی نہ پائے تو زمین پر ہاتھ مار کر اور مسح کر کے نماز پڑھ لے سکتا ہے!۔ تم یہود کے ان فتنوں سے ہوشیار رہو اور پیغمبرؐ کی پیروی پر جمے رہو۔ یہ یہود تمہارے دشمن ہیں لیکن یہ تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے اگر تم نے خدا پر بھروسہ کیا۔ اللہ تمہاری مدد کے لئے کافی ہے۔

[۴۶—۴۷] یہود کی بعض شرارتوں کا حوالہ جو وہ اسلام اور پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے کے لئے کر رہے تھے اور اس شرارت کے آخری نتائج سامنے آنے سے پہلے ان کو توبہ اور اصلاح کی دعوت۔

[۴۸—۵۷] یہود اپنی پاکی و برتری کے جھوٹے دعوے کر کے مسلمانوں کو گرانے کی جو کوشش



کر رہے تھے، یہاں تک کہ مشرکین کو بھی ان پر ترجیح دیتے تھے، اس کی تردید کہ یہ ساری باتیں محض ان کے حسد کا نتیجہ ہیں لیکن ان کے حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے نبی خاتمؐ اور ان کی امت کے لئے یہ فیصلہ فرما لیا ہے کہ وہ ان کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم حکومت عطا فرمائے گا اور یہ حاسد یہود ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

[۵۸—۵۹] مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کہ اب اہل کتاب سے چھین کر شریعت الٰہی کی یہ امانت تمہارے سپرد کی جا رہی ہے تو تم یہود کی طرح اس امانت میں خیانت کرنے والے نہ بننا بلکہ اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والے بننا اور ہر حال میں عدل پر قائم رہنا — نیز اللہ اور رسول اور اپنے اولوالامر کی اطاعت کرتے رہنا، اس کے بغیر اس امانت کی ذمہ داریاں ادا نہیں ہو سکتیں اور اگر کسی امر میں اختلاف واقع ہو، تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹانا تاکہ اس نزاع کا صحیح فیصلہ ہو سکے اور وہ تمہارے شیرازے کو درہم برہم نہ کرنے پائے۔

[۶۰—۷۰] منافقین کو ملامت کہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع ہونے کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں سے میل جول رکھتے ہیں اور اس کو بڑی دانشمندانہ سیاست سمجھتے ہیں حالانکہ اس وقت تک ان کا ایمان ہی معتبر نہیں ہے جب تک وہ پورے پورے طور پر اپنے آپ کو پیغمبرؐ کے حوالہ نہ کر دیں اور ہر معاملے میں ان کی اطاعت نہ کریں۔

[۷۱—۷۶] مسلمانوں کو اپنی مدافعت اور دار الکفر میں گھرے ہوئے مظلوم مسلمانوں کی آزادی کے لئے جہاد کی تاکید۔ ان منافقین کو ملامت جو جہاد سے جی چراتے تھے، مسلمانوں کی ہمتیں پست کرتے تھے غنیمت میں حصہ داری کے متمنی و مدعی تھے لیکن خطرہ کوئی بھی مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔

[۷۷—۸۰] منافقین کی اس متضاد روش پر ملامت کہ جب تک جہاد کا حکم نہیں ہوا تھا اس وقت تک تو وہ اپنی منافقت پر پردہ ڈالنے کے لئے جہاد کے لئے اپنی بے قراری کا اظہار کرتے تھے لیکن اب کہ جہاد کا حکم دے دیا گیا تو جس طرح خدا سے ڈرنا چاہئے، اس طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اسلام کے دشمنوں سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ موت سے کہیں بھی مفر نہیں۔ ان کی کج فہمی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس کو تو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن اگر کوئی ابتلا پیش آ جائے تو اس کو پیغمبرؐ کی بے تدبیری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ خیر و شر سب خدا ہی کی طرف سے ہے البتہ شر جو پیش آتا ہے تو ان کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آخر میں پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ جو تمہاری اطاعت کریں وہی درحقیقت خدا کی اطاعت کرنے والے ہیں، جو تمہاری اطاعت سے گریز اختیار کریں ان کا

معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ تم پر ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔

[۸۱ — ۸۵] منافقین کی روش کی مزید تفصیل کہ جب پیغمبرؐ کے سامنے ہوتے ہیں تب تو ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن جب وہاں سے ہٹتے ہیں تو ہر بات میں میخ نکالنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ پیغمبرؐ جو کچھ بھی کہتے ہیں سب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ قرآن کی کامل ہم آہنگی شاہد ہے کہ اس میں کوئی چیز بھی غیر اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔

پھر منافقین کی اس شرارت کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر ان کو امن یا خطرے کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو سنسنی پیدا کرنے کے لئے اس کو فوراً پھیلا دیتے ہیں حالانکہ صحیح روش یہ ہے کہ اس کو رسولؐ اور اربابِ حل وعقد کے سامنے پیش کرتے تاکہ وہ اس پر غور کرکے اس کے تدارک کے لئے صحیح قدم اٹھاتے لیکن یہ مسلمانوں کے دل بٹھانے کے لئے یہ شرارت کرتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو کسی حق کی تائید میں کوئی کلمۂ خیر کہے گا تو اس میں سے اس کو حصہ ملے گا اور جو کسی حق کی مخالفت میں کلمۂ شر زبان سے نکالے گا تو اس میں سے بھی اس کو حصہ ملے گا۔

[۸۶ — ۸۷] منافقین کی مذکورہ بالا روش کے باوجود مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ معاشرہ کے اندر ان کو نکو بنانے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ ظاہری سلوک ان کے ساتھ وہی رکھا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ یعنی ان کے ساتھ سلام وکلام باقی رکھا جائے۔

[۸۸ — ۹۱] جو منافقین دارالکفر میں پڑے ہوئے ہیں اور جن کی ساری ہمدردیاں کفار کے ساتھ ہیں، دارالاسلام کے مسلمانوں کو ان کے ساتھ اس وقت تک دوستی وحمایت کا تعلق پیدا نہیں کرنا چاہیئے جب تک وہ دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کر آئیں۔ اگر وہ ہجرت نہ کریں تو ان کے ساتھ بھی اسی طرح جنگ جائز ہے جس طرح دشمن کے ساتھ۔ اس سے صرف وہ مستثنیٰ ہوں گے جن کا تعلق یا تو کسی ایسی قوم سے ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہے یا جن کے متعلق یہ علم ہے کہ یہ اپنی کمزوری کی وجہ سے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنا چاہتے، نہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے لڑنے کی ہمت رکھتے۔ مگر جن کے متعلق معلوم ہے کہ اگر ان کے اوپر خود ان کی قوم کا یا دوسرے کفار کا دباؤ پڑ جائے گا تو وہ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے تو وہ دشمن ہی کے حکم میں ہیں۔ ان سے جنگ جائز ہے۔

[۹۲ — ۹۴] دارالحرب میں پڑے ہوئے مسلمانوں کی جان ومال کے احترام سے متعلق بعض احکام۔



[۹۵ — ۱۰۰] دارالحرب کے مسلمانوں کو ہجرت اور جہاد کی تاکید تاکہ وہ کفر کے ماحول سے نکل کر اسلامی معاشرے میں آئیں اور اپنے ایمان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کو قوت بہم پہنچائیں۔

[۱۰۱ — ۱۰۴] جہاد کے لئے ہر وقت مستعد رہنے کے حکم کے تعلق سے خطرے کی حالت میں نماز کا طریقہ۔

[۱۰۵ — ۱۲۶] ان مسلمانوں کو تنبیہ جو کھلے ہوئے منافقین کے معاملے میں بھی مداہنت برتتے تھے یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی طرف سے مدافعت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ فرمایا کہ پیغمبرؐ کے خلاف منافقین کی سرگوشیاں اور سرگرمیاں اور اسلام کی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرنے کی کوشش کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ یہ چیز اپنی فطرت کے لحاظ سے شرک ہے اور شرک کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف فرمانے والا نہیں ہے۔ خدا کے ہاں جھوٹی آرزوئیں کام آنے والی نہیں ہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح کام آنے والا ہے۔

[۱۲۷ — ۱۳۰] ابتدائے سورہ میں جو احکام یتامیٰ، ان کی ماؤں اور عورتوں سے متعلق بیان ہوئے، ان کے متعلق بعد میں پیدا ہونے والے بعض سوالوں کے جواب۔

[۱۳۱ — ۱۴۷] مسلمانوں کو پوری سختی کے ساتھ اس بات کی تاکید کہ جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اس پر بے چون وچرا عمل کرو، اس سے گریز وفرار کی راہیں نہ اختیار کرو اور منافقین کی کفر دوستی سے پوری شدت کے ساتھ اظہارِ بیزاری اور یہ وعید کہ ان منافقین اور کفار دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔

[۱۴۸ — ۱۴۹] مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کہ ہر چند منافقین ہر ملامت کے سزاوار ہیں لیکن بے ضرورت بدزبانی وسخت کلامی ان کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

[۱۵۰ — ۱۶۲] اہل کتاب بالخصوص یہود کو، جو اس مرحلے میں طرح طرح کی سازشوں اور مختلف قسم کے اعتراضات سے مخالفت کے محاذ کو تقویت پہنچا رہے تھے، سرزنش اور ان کے اعتراضات کے جواب۔

[۱۶۳ — ۱۷۵] قرآنی دعوت کے مرتبہ ومقام کی وضاحت اور اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کو دعوت ونصیحت کہ اس روشنی کی، جو اللہ نے اتاری ہے، قدر کریں اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے نہ پھریں۔

(۱۷۶) ایک آیت مبینہ جو شروع میں بیان کردہ احکام کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی۔

مذکورہ بالا تجزیے پر تدبر کی نگاہ ڈالئے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ آیت ۴۳ تک تو معاشرہ سے متعلق احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں اور ضمناً کہیں کہیں اس ردِّ عمل کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے جو ان احکام کا مخالفین پر ہوا لیکن آیت ۴۳ کے بعد کلام کا رخ بالتدریج مخالفین اور ان کے ردِّ عمل ہی کی طرف مڑ گیا ہے اور اس رویے پر تفصیل کے ساتھ تنقید کی گئی ہے جو اس دعوتِ اصلاح کی مزاحمت کے لئے اہلِ کتاب اور منافقین نے اختیار کیا۔ منافقین اس میں خاص طور پر زد میں آتے ہیں۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے سورہ کے دیباچہ میں ظاہر کیا، یہ ہے کہ معاشرے کے استحکام کے نقطۂ نظر سے اس سورہ میں اس مارِ آستین گروہ کی بیخ کنی ضروری تھی۔

قرآن مجید کے متعلق یہ بات یاد رکھئے کہ یہ صرف فقہی احکام کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ دعوت کا صحیفہ بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کے لئے اس ردِّ عمل سے تعرض ناگزیر ہے جس سے ان احکام کی تعلیم کے دوران میں سابقہ پیش آیا۔ چنانچہ قرآن ہر جگہ ان احکام کے پہلو بہ پہلو ان حالات سے بھی بحث کرتا ہے جو مخالفین نے اس وقت بالواسطہ یا بلاواسطہ پیدا کئے اور ان سے بحث کرنا تعلیم و دعوت کے نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہے لیکن جو لوگ قرآن کی اس خصوصیت سے واقف نہیں ہیں وہ اس بات سے حیران ہوتے ہیں کہ ان فقہی احکام کے ساتھ منافقین و معاندین کے اس تفصیلی ذکر کا کیا موقع تھا۔

بقیہ:- تدبر قرآن صفحہ [illegible] سے آگے

پاتے ہیں لیکن صلۂ رحم اور خاندانی و انسانی ہمدردی کے عام حقوق پھر بھی باقی رہیں گے چنانچہ وارثوں کو خطاب کر کے ہدایت ہوئی کہ اگر کسی کی وراثت تقسیم کرتے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو ہر چند وراثت میں ان کا کوئی شرعی حق نہ ہو تاہم وہ ڈانٹ ڈپٹ نہ جائیں بلکہ ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دلا کر ان کی دلداری کی کوشش کی جائے۔ فرمایا کہ یہ بات بھولنی نہیں چاہیئے کہ جس طرح دوسروں کے بچے یتیم ہوئے ہیں اسی طرح ان کے بچے بھی یتیم ہو سکتے تھے۔ پھر سوچیں کہ اگر یہ اپنے پیچھے یتیم چھوڑتے تو ان کے دل میں ان سے متعلق کیا کچھ اندیشے ہوتے۔ اس وجہ سے اللہ سے ڈرنا چاہیئے اور سیدھی بات کرنی چاہیئے۔

آخر میں آخری تنبیہ فرمائی کہ جو لوگ ظلم و حق تلفی کی راہ سے اپنے پیٹوں میں یتیموں کے مال بھر رہے ہیں وہ انجام کار کے اعتبار سے اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور آخرت میں وہ اس آگ کو لیے ہوئے دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔



# ۴ — سورہ نساء

## مدنی — آیات ۱۷۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (۱)

ترجمہ

اے لوگو، اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالبِ مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطع رحم سے۔ بے شک اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔ (۱)

## ۱۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

خلق منھا زوجھا

'خلق منھا زوجھا' کے معنی ہیں اسی کی جنس سے۔ اگرچہ اس کے معنی لوگوں نے اور بھی لیے ہیں لیکن جس بنیاد پر لیے ہیں وہ نہایت کمزور ہے۔ ہم نے جو معنی لیے ہیں اس کی تائید خود قرآن میں موجود ہے۔ سورہ نحل میں فرمایا ہے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (۷۲) ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں۔ اس کے یہ معنی کوئی بھی نہیں لے سکتا کہ یہ بیویاں ہر ایک کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔

تساءل

'تساءل' کے معنی باہم دگر ایک دوسرے سے پوچھنے، سوال کرنے اور مانگنے کے ہیں۔ پھر اسی سے ترقی کر کے ایک دوسرے سے طالبِ مدد ہونے کے معنی میں بھی یہ استعمال ہوتا ہے

سورہ مومنوں میں ہے فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ (جب صور پھونکا جائے گا تو نہ ان کے نسبی تعلقات باقی رہیں گے اور نہ وہ ایک دوسرے سے طلب مدد ہی کر سکیں گے ۔ ۱۰۱)

ارحام

ارحام سے مراد رحمی رشتے ہیں ۔ ان کو اللہ پر عطف کر کے ان کی وہ اہمیت واضح فرمائی ہے جو دین میں ان کی ہے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا کے بعد پہلی چیز جو تقویٰ اور احترام کی سزاوار ہے وہ رشتۂ رحم اور اس کے حقوق ہیں ۔ خدا سب کا خالق ہے اور رحم سب کے وجود میں آنے کا واسطہ اور ذریعہ ہے اس وجہ سے خدا اور رحم کے حقوق سب پر واجب ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اسی بنیاد پر رحم کا یہ درجہ رکھا ہے کہ جو اس کو جوڑتا ہے خدا اس سے جڑتا ہے اور جو اس کو کاٹتا ہے خدا اس سے کٹتا ہے ۔ یہ بات ایک حدیث قدسی سے بھی ثابت ہے اور یہی بات قرآن سے بھی نکلتی ہے ۔

زیر بحث آیت ایک جامع تمہید ہے ان تمام احکامات و ہدایات کے لیے جو انسانی معاشرہ کی تنظیم کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں اور جو آگے آ رہے ہیں ۔ اس تمہید میں جو باتیں بنیادی حقائق کی حیثیت سے واضح کی گئی ہیں ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے ۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس آیت میں جس تقویٰ کی ہدایت کی گئی ہے اس کا ایک خاص موقع و محل ہے ۔ اس تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ یہ خلق آپ سے آپ وجود میں نہیں آ گئی ہے بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو سب کا خالق بھی ہے اور سب کا رب بھی ۔ اس وجہ سے کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو ایک بے مالک اور بے راعی کا ایک آوارہ گلہ سمجھ کر اس میں دھاندلی مچانے اور اس کو اپنے ظلم و تعدی کا نشانہ بنانے کی کوشش کرے بلکہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس کے معاملات میں انصاف اور رحم کی روش اختیار کرے ۔ وہ نہ یاد رکھے کہ خدا بڑا زبردست اور بڑا منتقم و قہار ہے جو اس کی مخلوق کے معاملات میں دھاندلی مچائیں گے وہ اس کے قہر و غضب سے نہ بچ سکیں گے ۔ وہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے ۔

دوسری یہ کہ تمام نسل انسانی ایک ہی آدم کا گھرانا ہے ۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم و حوا کی نسل سے پیدا کیا ہے ۔ نسل آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں ۔ اس پہلو سے عربی و عجمی ، احمر و اسود اور افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں ، سب خدا کی مخلوق اور سب آدم کی اولاد ہیں ۔ خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے ۔ اس کا فطری تقاضا یہ ہے



کہ سب ایک ہی خدا کی بندگی کرنے والے اور ایک ہی مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں ۔

تیسری یہ کہ جس طرح آدم تمام نسل انسانی کے باپ ہیں اسی طرح حوا تمام نسل انسانی کی ماں ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم ہی کی جنس سے بنایا ہے اس وجہ سے عورت کوئی ذلیل ، حقیر ، فروتر اور فطری گنہگار مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ بھی شرف انسانیت میں برابر کی شریک ہے ۔ اس کو حقیر و ذلیل مخلوق سمجھ کر نہ اس کو حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہے نہ کمزور خیال کر کے اس کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے ۔

چوتھی یہ کہ خدا اور رحم کا واسطہ ہمیشہ سے باہمی تعاضد و تناصر کا محرک رہا ہے جس کو بھی کسی مشکل یا خطرے سے سابقہ پیش آتا ہے وہ اس میں دوسروں سے خدا اور رحم کا واسطہ دے کر اپیل کرتا ہے اور یہ اپیل چونکہ فطرت پر مبنی ہے اس وجہ سے اکثر حالات میں یہ مؤثر بھی ہوتی ہے ۔ لیکن خدا اور رحم کے نام پر حق مانگنے والے اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح ان کا واسطہ دے کر حق مانگنا حق ہے اسی طرح ان کا حق ادا کرنا بھی فرض ہے ۔ جو شخص خدا اور رحم کے نام پر لینے کے لیے تو چوکس ہے لیکن دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے وہ خدا سے دھوکا بازی اور رحم سے بے وفائی کا مجرم ہے اور اس جرم کا ارتکاب وہی کر سکتا ہے جس کا دل تقویٰ کی روح سے خالی ہو ۔ خدا اور رحم کے حقوق پہچاننے والے جس طرح ان ناموں سے فائدے اٹھاتے ہیں اسی طرح ان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں اور درحقیقت حق طلبی و حق شناسی کا یہی توازن ہے جو صحیح اسلامی معاشرے کا اصل جمال ہے ۔ اسی حقیقت کی طرف واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام کا ٹکڑا اشارہ کر رہا ہے ۔

## ۲۔ آگے کا مضمون آیات ۲ — ۱۰

آگے کی آیات میں تقویٰ ، عدل ، رحم اور رحم کی انہی بنیادوں پر جن کا ذکر اوپر ہوا ، سب سے پہلے یتیموں کے سرپرستوں کو مخاطب کر کے ان کی ذمہ داریاں بتائیں اور اس مشکل فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عدل و انصاف کے اندر رہتے ہوئے جو صورتیں ممکن تھیں ان کی طرف رہنمائی فرمائی ۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے زیر سرپرستی یتیموں کے مال اور حقوق کی پوری احتیاط کے ساتھ نگرانی اسی صورت میں کر سکتا ہے جب کہ وہ ان کی ماں کو بھی اپنے ساتھ

اس ذمہ داری میں شریک کرے تو اس مقصد کے لیے وہ تعددِ ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ عدل، چار تک کی قید اور ادائے مہر کے عام قانون کی ان کے باب میں بھی پیروی کرے۔ یہ عذر نہ پیدا کرے کہ چونکہ ان میں سے کسی سے اس نے نکاح کیا ہے تو انہی کی اولاد کے مصلحت سے کیا ہے اس وجہ سے وہ ان کے بارے میں عدل اور مہر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔

اس کے بعد بتایا ہے کہ یتیم کا مال کب اس کے حوالہ کرنا چاہیے اور اپنے زمانہ سرپرستی میں ایک نادار یا ایک مالدار سرپرست کو اس مال سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں کیا روش اختیار کرنی چاہیے۔

پھر ہدایت فرمائی ہے کہ شریعت میں وارثوں کے حقوق معین ہو جانے کے بعد بھی اگر کسی مورث کے مال کی تقسیم کے وقت اقربا، یتامیٰ اور مساکین آ جائیں تو گو قانونی طور پر اس میں ان کا حق نہ بنتا ہو تاہم اخلاقی طور پر ان کو اس میں سے کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے اور ان کی دلداری کی جائے۔

آخر میں فرمایا کہ جو لوگ ظلم و زیادتی کر کے یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور بالآخر وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَأْكُلُوا
أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ﴿۲﴾ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا
فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ
خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ﴿۳﴾
وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا
فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا ﴿۴﴾ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ
قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿۵﴾ وَابْتَلُوا
الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا
إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ وَمَن كَانَ
غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ



إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿۶﴾ لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿۷﴾
وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا
لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿۸﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا
خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ
أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿۱۰﴾ ربع

ترجمہ

اور یتیموں کے مال ان کو دو، نہ اپنے برے مال کو ان کے اچھے مال سے بدلو اور نہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس کو ہڑپ کرو۔ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ۲

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تمہارے لیے جائز ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو۔ اور اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر بس کرو یا پھر کوئی لونڈی جو تمہاری ملک میں ہو۔ یہ طریقہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔ اور ان عورتوں کو ان کے مہر دو مہر کی حیثیت سے، پس اگر وہ اس میں سے تمہارے لیے کچھ چھوڑ دیں اپنی خوشی سے تو تم اس کو کھاؤ کہ وہ تمہیں راس اور سازگار ہے۔ ۳-۴

اور تم وہ مال جس کو خدا نے تمہارے لیے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے نادان یتیموں کے حوالہ نہ کرو۔ ہاں اس سے ان کو فراغت کے ساتھ کھلاؤ پہناؤ اور دستور کے موافق ان کی دلداری کرتے رہو۔ اور ان یتیموں کو جانچتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم ان کے اندر سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو اور اس ڈر سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے اسراف اور جلد بازی کر کے ان کا مال ہڑپ نہ کرو۔ اور جو غنی ہو اس کو چاہیے کہ وہ پرہیز کرے اور جو محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالے کرنے

نگرانی پر گواہ ٹھہرا لو۔ ویسے اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔ ۶-۵-۴

والدین اور اقربا کے ترکے میں سے مردوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے اور والدین اور اقربا کے ترکے میں سے عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے، خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ۔ ایک مقررہ حصہ۔ اور اگر تقسیم کے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان سے دستور کے مطابق بات کرو۔ ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو اپنے پیچھے اگر ناتوان بچے چھوڑتے تو ان کے معاملے میں بہت اندیشہ ناک ہوتے۔ پس انہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات زبان سے نکالیں۔ ۹-۷

جو لوگ ظلم و ناانصافی سے یتیموں کے مال ہڑپ کر رہے ہیں وہ تو بس اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔ ۱۰

## ۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۲

اس آیت میں خطاب یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے اور اوپر والی آیت پر اس کا عطف اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے یا جس چیز سے روکا جا رہا ہے اس کی بنیاد انہی اصولی حقائق پر ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔

خبیث اور طیب کے الفاظ جس طرح ان اشیا اور ذوات کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو اخلاقی و شرعی نقطۂ نظر سے خبیث یا طیب ہوتی ہیں اسی طرح، جیسا کہ بقرہ کی آیت ۲۶۷ کے تحت گزر چکا ہے، ان اشیاء کے لیے بھی ان کا استعمال عربی میں معروف ہے جو مادی اعتبار سے ناقص یا عمدہ ہوتی ہیں۔

اکل کے ساتھ 'الیٰ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں 'ضمًّا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔

یتیموں کے بعض سرپرست، جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہوتے ہیں اول تو یتیموں کا سارا



حق ہڑپ کر بیٹھتے ہیں اور اگر دیانت بھی برتیں تو اس میں خورد برد کرنے کی نیت سے، انتظامی سہولت کی خاطر ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے ہاتھ رنگنے کے نہایت آسان مواقع پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ یتیموں کا مال یتیموں کو دو، خود ہضم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر اس مقصد کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے مثلاً یہ کہ اپنے ناقص مال کو ان کے اچھے مال سے بدلنے کی تدبیریں کرو اور نہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کو خورد برد کرنے کی کوشش کرو۔

اگر کوئی سرپرست انتظامی سہولت کے نقطۂ نظر سے یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملانا چاہے تو اس کی اجازت اگرچہ، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۰ کے تحت گزر چکا ہے، شریعت نے دی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس اختلاط و اشتراک سے مقصود اصلاح ہو نہ کہ فساد۔ بصورت دیگر یتیم کے حق کی حفاظت اسلامی حکومت پر عاید ہوتی ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۳

'یتامیٰ' کا لفظ ان نابالغوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا باپ فوت ہو چکا ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ نابالغ، لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ صرف نابالغ لڑکیوں کے لیے اس کا استعمال نہ عربی زبان میں معلوم ہے، نہ قرآن مجید اور حدیث میں۔ قرآن میں یہ لفظ کم از کم پندرہ جگہ اسی جمع کی صورت میں استعمال ہوا ہے لیکن کسی جگہ بھی صرف یتیم بچیوں کے مفہوم میں نہیں استعمال ہوا ہے۔

'مَا طَابَ لَكُمْ' کے معنی بعض اہل تاویل نے 'مَا حَلَّ لَكُمْ' یعنی جو عورتیں تمہارے لیے جائز ہوں لیے ہیں۔ یہ مفہوم لفظ کے استعمالات کے مطابق ہے۔ اگرچہ از روئے لغت و از روئے استعمال اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو ناحق ہوں۔ آگے والی آیت میں 'فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ' کے الفاظ سے اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ نیز یہ مفہوم بھی اس کا ہو سکتا ہے کہ جن سے تمہاری زندگی میں خوشگواری پیدا ہو۔ یہاں یہ تمام معانی بنتے ہیں۔ لیکن ہم نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترتیب و محل سے یہ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

'نساء' کا لفظ اگرچہ ظاہر میں عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے تمام عورتیں مراد نہیں

ہیں بلکہ یتیموں کی مائیں مراد ہیں۔ یہ قرینہ چونکہ مضمون کے تدریجی ارتقا سے خود بخود واضح ہو جائے گا اس وجہ سے یہاں اس کے دلائل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم (مخاطب یتیموں کے اولیاء اور سرپرست ہی ہیں) برنبائے احتیاط یہ اندیشہ رکھتے ہو کہ تمہارے لیے یتیموں کے مال اور ان کے واجبی حقوق کی کما حقہٗ نگہداشت ایک مشکل کام ہے، تم تنہا اپنی ذمہ داری پر اس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اگر یتیموں کی ماں بھی اس ذمہ داری میں تمہارے ساتھ شریک ہو جائے تو تم اس فرض سے عمدہ طریقے پر عہدہ برآ ہو سکتے ہو اس لیے کہ یتیموں کے ساتھ جو قلبی لگاؤ اس کو ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا اور ان کے حقوق کی نگہداشت جس بیداری کے ساتھ وہ کر سکتی ہے کسی اور کے لیے ممکن نہیں تو ان میں سے جو تمہارے لیے جائز ہوں، ان سے تم نکاح کر لو۔ بشرطیکہ عورتوں کی تعداد کسی صورت میں چار سے زیادہ نہ ہونے پائے اور تم ان کے درمیان عدل قائم رکھ سکو۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ عدل نہیں قائم رکھ سکو گے تو پھر ایک سے زیادہ نکاح نہ کرو۔ فرمایا کہ یہ طریقہ تمہیں حق و انصاف پر استوار رکھنے کے نقطۂ نظر سے زیادہ صحیح ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیویوں کے معاملے میں عدل کی شرط ایک ایسی اٹل شرط ہے کہ یتامیٰ کے حقوق کی نگہداشت جیسی اہم دینی مصلحت کے پہلو سے بھی اس میں کسی لچک کے لیے شریعت نے گنجائش نہیں رکھی ہے۔

یہاں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو گا کہ آیت کی تاویل اگر یہ ہے جو بیان ہوئی تو اس سے تو صاف یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام میں تعدد ازواج کی اجازت مطلق نہیں بلکہ یتیموں کی مصلحت کے ساتھ مقید ہے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ یہاں مسئلے کے بیان کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ یتامیٰ کی مصلحت کی قید کے ساتھ تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہو اور بصورت دیگر یہ ممنوع ہو بلکہ یہ ہے کہ یتامیٰ کی مصلحت کے نقطۂ نظر سے تعدد ازواج کے اس رواج سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عرب میں تھا البتہ اس کو چار تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اگر مقصود تعدد ازواج کو یتامیٰ کی مصلحت کے ساتھ مقید کرنا ہوتا تو اس کے لیے اسلوب بیان اس سے بالکل مختلف ہوتا۔ اس اسلوب بیان سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ تعدد ازواج کی مروجہ صورت پر ایک قید عائد کر کے اس سے ایک معاشرتی مصلحت میں فائدہ اٹھانے کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے، لیکن معاشرتی مصلحت صرف ایک یتیموں ہی کی مصلحت نہیں ہے بلکہ اور



بھی ہو سکتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس میں اس سے فائدہ اٹھانے کی ممانعت ہو۔

ممکن ہے یہاں ایک اور شبہ بھی بعض لوگوں کو ہو کہ ہم نے یہاں ان لوگوں کے قول کو جنہوں نے یتامیٰ سے یتیم لڑکیوں کو مراد لیا ہے محض اس دلیل کی بنیاد پر نظر انداز کر دیا ہے کہ اس لفظ کا استعمال صرف لڑکیوں کے لیے معروف نہیں ہے حالانکہ نساء سے ہم نے یتیموں کی ماؤں کو مراد لیا ہے جب کہ اس لفظ کا بھی استعمال اس معنی کے لیے معروف نہیں ہے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اس قول کو صرف اسی بنیاد پر نظر انداز نہیں کیا ہے کہ لغت اور استعمال اس کے حق میں نہیں ہے بلکہ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ یہ معنی لینے میں آیت کی تاویل صحیح نہیں بنتی۔ کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر وہ ایک یتیم بچی سے نکاح کرے گا تو چونکہ اس کا باپ یا بھائی موجود نہیں ہے اس وجہ سے وہ اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا تو اس کو یہ ہدایت ہونی تھی کہ وہ اس وقت تک اس کے ساتھ نکاح کرنے میں توقف کرے جب تک وہ بالغ ہو کر اپنے حقوق و فرائض کو اپنے اختیار و ارادے کے ساتھ سمجھ سکنے کے قابل نہ ہو؛ یہ ہدایت ہونی تھی کہ ایسا شخص کسی اور عورت سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ تعدد ازواج کی اجازت اور اس کے قیود و شرائط کے بیان کے لیے کوئی ضرورت داعی نہیں تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک یتیمہ بالغ ہونے کے بعد بھی باپ بھائی کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بے بس ہی ہوتی ہے تو یہ ہدایت ہونی تھی کہ ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن کے باپ بھائی زندہ ہوں اس لیے کہ اس قسم کی بے بسی تو دوسری عورتوں کو بھی لاحق ہو سکتی ہے اگر چہ ان کو یتیمی کی بے بسی سے سابقہ نہ پیش آیا ہو۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر کسی کی نگرانی میں کوئی یتیمہ ہو، وہ اس کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے اور اس کے بالغ ہونے پر اس کی رضامندی سے اس سے نکاح کرے تو شریعت میں یہ بات ناپسندیدہ نہیں بلکہ پسندیدہ ہے۔

بہرحال ہم نے اس قول کو صرف ایک ہی وجہ کی بنا پر نہیں بلکہ متعدد وجوہ کی بنا پر چھوڑا ہے اور نساء کے لفظ کی جو تخصیص کی ہے وہ ان قرائن کی بنا پر ہے جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے اور بعض آگے آرہے ہیں۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد لونڈیاں ہیں۔ چونکہ ان کے معاملے میں عدل وغیرہ کی شرط نہیں ہے اس وجہ سے ان کی اجازت دی۔ اس مسئلے کی صحیح نوعیت پر ہم بقرہ میں لکھ چکے ہیں۔ آگے موزوں مقام پر اس پر مزید بحث کریں گے۔

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ
هَنِيئًا مَّرِيئًا (۴)

اس آیت میں بھی نساء سے مراد یتیموں کی مائیں ہیں۔ نحلۃ کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں اور جب عورت کے تعلق سے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنی مہر ادا کرنے کے ہو سکتے ہیں۔ نحلۃ یہاں حال کی تاکید کے لیے ہے یعنی ان کو اس طرح مہر دو جو مہر دینے کا طریقہ ہے۔ اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ جب ان کے ساتھ نکاح انہی کے بچوں کی مصلحت سے کیا گیا ہے تو ایک شخص خیال کر سکتا ہے کہ اس صورت میں مہر وغیرہ کی پابندی نہیں ہونی چاہیے فرمایا کہ نہیں، جس طرح عدل شرط ہے اسی طرح مہر کی ادائیگی بھی شرط ہے اور یہ مہر مہر کی طرح ادا ہونا چاہیے صرف چھٹا اتارنے کی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔

فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ میں حرف 'عن' دستبرداری کے مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے، یعنی وہ اپنی خوشی سے اگر اپنے مہر کا کوئی حصہ معاف کر دیں تو تم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو، یہ تمہارے لیے رچنے پچنے والی چیز ہو سکتی ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ
فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا (۵)

'سفہاء' سے مراد وہی یتامیٰ ہیں جن کا ذکر چل رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حکم جو دیا گیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کو دو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ بالکل نادان و ناسمجھ ہوں جب بھی جو کچھ ان کا ہے ان کے حوالہ کر دو۔ مال کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے اس وجہ سے اس کے اندر انفرادی حق کے ساتھ خاندانی اور اجتماعی بہبود کا بھی ایک پہلو ہے اس پہلو سے اس کی بربادی میں ایک ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ پورے خاندان اور بالواسطہ پورے معاشرے کا نقصان ہے۔ یہ چیز متقاضی ہے کہ کوئی ایسی شکل اختیار نہ کی جائے جو کسی مال کی بربادی کا باعث ہو۔ اگر یتیم ابھی نادان و ناسمجھ ہے تو سرپرست کا فرض ہے کہ وہ اس کے مال کو اپنی حفاظت و نگرانی میں رکھے البتہ اس کو کھلائے پہنائے اور اس کی دلداری کرتا رہے تاکہ اس کو اطمینان رہے کہ یہ نگرانی اسی کے فائدے کے لیے ہے اور ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہو جانے کے بعد اس کی ہر چیز اسی کو ملنی ہے۔

'وارزقوھم فیھا' میں 'فیھا' کے لفظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یتیموں کی ضروریات پوری



کرنے میں سرپرستوں کو کشادہ دلی سے کام لینا چاہیے، خسیس اور بخیل جو سرپرستوں کا سا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ عربی میں جب کہیں گے کہ ارزقوھم فیھا تو اس کے معنی ہوں گے ان کو فراخی سے کھلاؤ پلاؤ اور اگر کہیں وارزقوھم منھا جیسا کہ آگے آیت ۸ میں آ رہا ہے تو اس کے معنی ہوں گے، ان کو اس میں سے کچھ دے دلا دو۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا
فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ وَمَن
كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ
أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا (۶)

یہ وہ طریقہ بتایا ہے جو یتیموں کا مال ان کے حوالے کرنے کے معاملے میں سرپرستوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ یتیموں کو جانچتے رہو یعنی کوئی چھوٹی موٹی ذمہ داری ان کے سپرد کر کے ان کی صلاحیت کا امتحان کرتے رہو کہ معاملات کی سوجھ بوجھ ان کے اندر پیدا ہو رہی ہے یا نہیں۔ نکاح کی عمر یعنی بلوغ تک، ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھنا چاہیے۔ جب بالغ ہو جائیں تو اس وقت اگر یہ محسوس ہو کہ ان کے اندر اب اپنی ذمہ داریوں کے اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے تو ان کا مال ان کے سپرد کر دینا چاہیے۔

آیت میں اس بات کا اشارہ صاف موجود ہے کہ جسمی بلوغ ہر حال میں عقلی رشد کو مستلزم نہیں ہے۔ ایسے بھی کتنے بالغ ہو سکتے ہیں جو بالغ ہو جانے کو تو ہو جاتے ہیں لیکن ناک گی ہی رہ جاتی ہے۔ ایسے اطفال اور بالغ نادانوں کے معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس چیز کو ان کے مال پر قابض رہنے کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے بلکہ جو کچھ کرنا چاہیے ان کی بہبود کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔

سرپرست اگر مستغنی آدمی ہو تو اس کو یتیم کے مال میں سے کچھ لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر غریب ہو تو دستور کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ دستور کے مطابق سے مراد یہ ہے کہ ذمہ داریوں کی نوعیت، جائداد کی حیثیت، مقامی حالات اور سرپرست کے معیار زندگی کے اعتبار سے جو فائدہ اٹھائے وہ معقولیت کے حدود کے اندر ہو، یہ نوعیت نہ ہو کہ ہر معقول آدمی پر یہ اثر پڑے کہ یتیم کے بالغ ہو جانے کے اندیشے سے اسراف اور جلد بازی کر کے یتیم کی جائداد کو ہضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں یہ ہدایت ہوئی کہ یتیم کا مال جب اس کے حوالہ کرنے لگو تو اس پر کچھ ثقہ اور معتبر لوگ گواہ بھی بنا لو تاکہ کسی سوء ظن اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے۔ علاوہ اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھو کہ سارے معاملات کا حساب خدا کے ہاں بھی دینا ہے۔ اگر کسی قسم کی خیانت ہوئی تو ہو سکتا ہے کہ دنیا کے شاہدوں اور گواہوں کی نگاہ اس پر نہ پڑے لیکن خدا کی نگاہ کسی چیز سے بھی نہیں چوک سکتی۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ
الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ○ وَإِذَا حَضَرَ
الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا
مَّعْرُوفًا ○ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا
اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ○ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا
يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ○ ۷—۱۰

یتامیٰ کے حقوق کے تحفظ کے بعد اب یہ تمہید ہے اس قانونِ وراثت کی جس میں مردوں اور عورتوں دونوں کے حقوق، ان کے والدین و اقرباء کے ترکے میں سے متعین کر دیے گئے تاکہ نہ تو عصبات اور وارثوں کے لیے مورث کی تمام املاک و جائداد کو سمیٹ کر اس پر قابض ہو جانے کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے۔ اسلام سے پہلے نہ صرف عرب میں بلکہ ساری دنیا میں یہ حال رہا ہے کہ یتیموں اور عورتوں کا کیا ذکر، تمام کمزور وارث زبردست عصبات اور وارثوں کے رحم و کرم پر تھے۔ قرآن نے اس صورت حال کی طرف دوسرے مقام میں وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس صورت حال کو ختم کر دینے کے لیے قرآن نے تمام وارثوں کے حقوق متعین کر دیے۔ مردوں کے بھی، عورتوں کے بھی۔ اوپر کی آیات کی تلاوت کرتا ہوا آدمی جب اس آیت پر پہنچتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ گویا یتیموں کی برکت سے دوسروں کے حقوق متعین کرنے کی بھی راہ کھل گئی۔ یعنی جو خود حقوق سے محروم تھے انہوں نے نہ صرف یہ کہ حقوق حاصل کیے بلکہ ان کی بدولت دوسرے لوگ بھی حقوق حاصل ہوئے۔ خاص طور پر عورتوں کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا پہلی بار ان کو بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو حق داروں کی صف میں جگہ ملی اور اپنے والدین و اقرباء کے ترکے میں سے، خواہ کم ہو یا زیادہ، ان کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک متعین حصہ فرض کر دیا گیا۔
حصے متعین ہو جانے کے بعد قانونی حقدار وہی ہوں گے جو ازروئے شریعت وارث قرار

(باقی بر صفحہ ۴۳)



افاداتِ فراہیؒ

تاریخِ اقوام سے

خالد مسعود

# ملکوتِ الٰہی پر شہادت

اب ہم کتبِ مقدسہ کی تعلیم کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال پر غور کرتے ہیں اور ان کے حقیقی احوال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بارے میں ہمیں عاد و ثمود، فرعون، قوم تبع اور ہابیل و قابیل کے قصوں کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے ہمیں کافی معلومات انہی واقعات سے حاصل ہو جاتی ہیں جو ہماری جدید تاریخ بیان کرتی ہے اور جس کو مورخین نے کسی دینی غرض سے نہیں لکھا ہے۔ انہی کے مطالعہ سے تم اس حقیقت تک پہنچ جاؤ گے کہ بدکاریوں کے نتیجہ میں ذلت و نکبت انسان پر آتی ہے اور بھلائیاں اپنے حاملوں کے لئے برکتیں لاتی ہیں۔

یہ حقیقت دو سبب سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ لوگوں کے اندر اپنی قوم کے لئے جذباتی عصبیت ہوتی ہے اور دوسری قوم کو وہ ہیچ سمجھتے ہیں، خصوصاً اگر وہ ان پر غلبہ پائے ہوئے ہو۔ مثال کے طور پر ایرانی، ہندوستانی اور یورپین اقوام مسلمانوں کی حکومت کی برتری تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح نہ مسلمان اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی سلطنت میں واقعی کچھ خوبیاں تھیں اور نہ روسیوں کے دل جاپانیوں کی اخلاقی شرافت کے قائل ہوتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح طالوت کو بادشاہ بنائے جانے پر یہود نے کہا تھا کہ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ (اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس سے زیادہ حقدار ہم اس امارت کے ہیں اور اسے تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں)

اس پر ان کے نبی نے طالوت کی فضیلت کے پہلو واضح کرتے ہوئے کہا:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (اللہ نے تمہاری سرداری کے لئے اس کو چنا اور اس کو علم اور جسم دونوں میں کشادگی عطا کی ہے اور اللہ جسے چاہے اقتدار بخشتا

بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔"

گویا یہاں یہ بات کھول دی کہ حکمرانی اللہ کی ہے۔ وہ چاہے تو کسی کو عطا کرے اور چاہے تو کسی سے سلب کرے۔ چونکہ وہ با اختیار ہے اس لئے کوئی رکاوٹ اس کے فیصلے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں وہ علیم بھی ہے اس لئے جو فیصلہ فرماتا ہے وہ حق اور عدل کے تقاضوں کے تحت فرماتا ہے۔

مذکورہ حقیقت کے مخفی رہنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ نتائج فوراً نہیں بلکہ تدریج کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور عمل اور اس کے نتیجے میں مدت دراز حائل ہوتی ہے۔

اگر مؤرخین نے تاریخ اس بنیاد پر مرتب کی ہوتی تو یہ خوب تر اور عقل سے قریب تر بھی ہوتی اور غیرت بھی ابھارنے والی ہوتی۔

**عقیدۂ ملکوت کا عملی فائدہ**

یہ طے پا جانے کے بعد کہ دنیا کے معاملات اور قوموں کو پیش آنے والے واقعات ایک مخفی تصرف اور خدائی حکومت کے تحت ہیں ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس عقیدہ کے اصول و فروع کو معلوم کریں۔ اس سے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم وہ کام کر سکتے ہیں جن سے بھلائی حاصل کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ ہم سیاسی قواعد کو حکومت الٰہیہ کے اصول پر منضبط کر سکتے ہیں یعنی ریاست کا انتظام ہم اس طریقہ پر کر سکتے ہیں جس کا تقاضا خدا کے احکام کرتے ہیں اور جس سے ہمارا رب رحمٰن خوش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، اگر دیکھا جائے تو علم تاریخ میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کے برعکس اس میں دو مضرتیں ہیں۔ ایک، اگلوں کی عظمت پر فخر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اکثر ہمیں غفلت میں ڈال دیتا ہے اور سعی و جہد پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ دوسری ان امور کی یاد دہانی جو دوسری قوموں کے معاملہ میں برابر غصہ بھڑکانے والے ہوتے ہیں مثلاً ہندو اور عیسائی اب بھی مسلمانوں سے بغض رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنا وہ وقت یاد آتا ہے جب مسلمانوں نے ان کو مغلوب کر لیا تھا۔ یہ لوگ اگر تاریخ کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھ سکتے تو اس سے فائدہ اٹھاتے کیونکہ اللہ تعالیٰ جب بھی ایک قوم کو غالب اور دوسری کو مغلوب کرتا ہے تو یہ ایک حکمت اور مصلحت کے ساتھ ہوتا ہے۔ غلبہ پانے والی قوم میں حکومت کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے جب کہ مغلوب ہونے والی قوم میں یہ مفقود ہوتی ہے۔ پس اگر یہ غلبہ پانے والوں کے اور اپنے احوال کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے تو انہیں ان کی کامیابی کے اسباب اور اپنی ناکامی کی وجہ معلوم ہو جاتیں۔ اس طرح اپنے حالات کی اصلاح سے انہیں فائدہ ہوتا۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو سورہ بقرہ کے اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں یہود سے نبوت اور آسمانی بادشاہت کو سلب کرنے اور ان کے اسماعیلی بھائیوں کو عطا کرنے کا بیان ہوا ہے۔



# حکومتِ الٰہیہ کے اصول

اب ہم حکومت الٰہیہ کے وہ اصول بیان کرتے ہیں جن کی خبر ہمیں قرآن مجید میں دی گئی ہے اور جن کی کارفرمائی کا مشاہدہ ہم دنیا کی تاریخ میں کرتے ہیں۔

**تخلیق کا سب سے بڑا مقصود نفس کا ارتقا ہے**

اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہانوں کی تخلیق اس مقصد سے کی ہے کہ انسانوں پر رحمت کرے اور رحمت کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کو رفعت دے کر کمال تک پہنچا دیا جائے۔ کمال کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی قربت ہے۔ قربت مکانی نہیں کیونکہ وہ تو انسان کو حاصل ہی ہے جیسا کہ فرمایا:

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ "ہم اس سے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔"

بلکہ قربت حال اور قربت صفات مراد ہے۔ خدا نے اس دنیا کو اپنے تک پہنچنے کا ایک زینہ بنایا ہے اور مخلوق کی صفات کے مختلف مدارج ہیں جن میں سب سے زیادہ اونچا درجہ حکمت و رافت کا ہے۔ پس جو شخص خدا کی معرفت رکھتا ہو اور اس میں رافت کا جذبہ بھی ہو وہ ایک بے خبر ظالم شخص کی نسبت خدا سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اب چونکہ کائنات کے پورے کارخانے کا مقصود انسان ہے اس لئے خدا کی سب سے بڑی نعمت اور رب ودود کی رأفت پانے کا سب سے زیادہ مستحق وہی ہے۔ وہ مادہ پرست جو زمین و آسمان کے عجائب، نظام شمسی کی وسعت اور فضائے بسیط کی پہنائیوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس حقیقت کو ماننے میں بہت ہی متامل ہوتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ چھوٹا سا انسان اس تگاپو کی غایت اور اتنی بڑی کائنات کا منتہیٰ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے تخلیق کے اندر کسی بڑے مقصد یا رحمے یا کسی پرحکمت مشیت کے کارفرما ہونے کا انکار کر دیا اور سرے سے ایک زندہ خدا ہی کے منکر ہو گئے۔ کاش، انہوں نے خود اپنے نفس پر غور کیا ہوتا اور اس دنیا میں جسے وہ اپنے خیال میں علم کی روشنی اور ارادے کی قوت سے خالی سمجھتے ہیں، وہ ایک علم رکھنے والے اور بارادہ نفس کی قدر و منزلت سے واقف ہو سکتے! یہ نفس ہی تو ہے جو یہاں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اجالا پیدا کرنے والا واحد تابندہ ستارہ ہے اور یہ عقل ہی تو ہے جو اس فلک ایوان کا روشن چراغ ہے۔ یہ لوگ نفس کے شرف کا انکار کر کے پروردگار عالم کے انکار پر تو تیار ہو گئے مگر اسی کے ساتھ اپنے دعوے کے بالکل برعکس انہوں نے

نادانستہ ایک ایسی بات کا اقرار بھی کر لیا جس کا پہلے انکار کر چکے تھے۔ یعنی انہوں نے انسان کو آسمان اور زمین ہر چیز کے اوپر لے جا بٹھایا اور وہاں سے وہ تمام مخلوقات پر لاف زنی کرنے لگا۔

## تمدن کے ذریعے سے تربیت نفوس

جب اللہ تعالٰی نے انسانوں پر رحمت کرنے کے لئے ان کو کمال تک پہنچانے کا فیصلہ فرمایا تو ان کی تربیت کے لئے اسباب بھی پیدا کئے۔ چنانچہ تمدن بھی نفس انسانی کو کمال تک پہنچانے کا ایک زینہ ہے اور اسی کی حقیقت وہ خلافت ہے جو اللہ تعالٰی نے ایک امت کے بعد دوسری امت کے سپرد فرمائی۔ چونکہ ہر امت کو اختیار کی آزادی بھی دی گئی تھی اس لئے ان کی آزمائش بھی خدا نے کی۔ اس امر کا بیان قرآن مجید کی متعدد آیات میں ہوا ہے۔ سورہ ہود میں فرمایا۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ (ہود - ۵۷)

پس اگر تم روگردانی کرو گے تو میں تو وہ پیغام تمہیں پہنچا چکا جس کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا گیا تھا اور میرا رب تمہارا جانشین کسی دوسری قوم کو بنا دے گا۔

سورۂ ابراہیم میں ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (ابراہیم - ۱۹)

تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں چلتا کرے اور ایک نئی مخلوق لے آئے۔

اسی طرح سورہ محمد میں ہے۔

وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۳۸)

اور اگر تم روگردانی کرو گے تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم لائے گا۔

## خلافت کے فرائض ادا کرنے کے لئے امت کا انتخاب

اللہ تعالٰی نے آدم ؑ اور ان کی ذریت کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دے کر خلافت کے لئے منتخب کیا اور ان کے لئے ایک مقدس سرزمین مخصوص کی جس میں سے پرانے صحیفوں کی شہادت کے مطابق ملحدوں اور ظالموں کو نکال دیا اور اس امر کو جزا اور عدل کی نشانی قرار دیا۔ چنانچہ ایک سرزمین اور ایک قوم کو اپنی ملکوت اور اپنی دینونت کے نفاذ کے لئے مخصوص کیا تاکہ یہ باقی عالم



کی دینونت کے لئے ایک دلیل بن جائیں۔

جہاں تک خلافت کے منصب کا تعلق ہے چونکہ اس کی بنیاد انسان کے اختیار پر ہے اس لئے یہ حریت اور آزادی کا شیرازہ ہے۔ پوری قوم ایک شخص کو اس لئے سربراہ بناتی ہے کہ وہ انہی کا ایک فرد ہوتا ہے ان کی مصلحتوں سے سب سے زیادہ واقف ہوتا ہے اور سب سے زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ وہ لوگوں سے جو مال حاصل کرتا ہے، اس میں امین ہوتا ہے اور اس کو قوم ہی کی طرف لوٹا دیتا ہے اس کی اپنی ذات بھی قوم میں سے ہی ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ غنیمت کے مال کا پانچواں حصہ خلیفہ کو ملیگا اور وہ اسے لوگوں ہی کو لوٹا دے گا۔ یہ ہیں خلیفہ کی بنیادی ذمہ داریاں لیکن دوسری طرف اس کا حق یہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ کیونکہ حکم و فیصلہ کا اختیار لوگ خود ہی اس کو عطا کرتے ہیں۔ لہذا اس کی نافرمانی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس کے افعال پر الزام دھرا جا سکتا ہے۔ اگر لوگ انتخاب کے وقت نیک نیتی کے ساتھ بہترین آدمی کو چننا چاہیں تو ان کا سب سے اچھا آدمی ہی سامنے آئیگا۔

جس طرح حکمران وہ مقرر ہوتا ہے جو لوگوں میں سب سے اچھا، تدابیر کو سب سے زیادہ جاننے والا، خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور عزم میں سب سے مضبوط ہو اسی طرح یہی صفات ان لوگوں کے لئے بھی ضروری ہیں جو مشورہ دینے میں اس کی اعانت کرتے اور احکام کے نفاذ میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ارباب بست و کشاد ہوتے ہیں اور انہی کے پاس رازوں اور راہوں کی امانتیں ہوتی ہیں۔ انہی لوگوں کو اولوالامر کا نام دیا گیا ہے۔ حکمران ان اولوالامر کے تعاون سے تمام امور کو عدل و قسط کے اصولوں کے مطابق طے کرتا ہے اور اسی کو ان کے مرکز اور نظام کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جمہور عوام اولوالامر کی اطاعت پر مامور ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان کے مصالح کو ان سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ پس عوام کی اطاعت آزادی اور اختیار کے ساتھ ہوتی ہے۔ کوئی شخص اولوالامر اسی وقت بنتا ہے جب اس سے صالح اعمال کے ظاہر ہونے کے نتیجے میں لوگ بجوشی اس کے آگے جھک جاتے ہیں محبت کی وجہ سے اس کا احترام کرتے ہیں اور اپنے مصالح میں اس کی رائے پر اعتماد کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ سب سے بڑے کام — یعنی خلیفہ کے انتخاب — میں انہی کو اپنا وکیل بنا دیتے ہیں کیونکہ یہ کام بڑا ہی پرخطر بھی ہوتا ہے اور صد درجہ مشکل بھی۔ مذکورہ تمام اصول قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور ہمارے اسلاف نے انہی پر عمل کر کے ہمارے لئے سنت چھوڑی ہے۔

## خلافت سلب کیسے ہوتی ہے

پھر جب عوام میں فساد پیدا ہو جائے تو وہ ان لوگوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو ان کی خواہشات کی موافقت کرنے والے ہوتے ہیں چنانچہ وہ

ظالموں کی مدد کر کے ان کو اولوالامر بنا دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں لوگ پہلے کے مقابل میں اور بڑے فتنے میں پڑ جاتے ہیں۔ یعنی یہ اولوالامر چونکہ برائی کے وکیل ہوتے ہیں اس لئے کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مضبوط اور صالح امیر پر متفق ہو سکیں جب باہم اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو فتنہ سر اٹھا لیتا ہے اور صلح و دوستی کی کیفیت زائل ہونے لگتی ہے۔ اسی لئے یہ اختلاف سب سے بڑی بیماری اور علت کا سبب ہے جو دشمن ہے اس کے نتیجے میں عوام کے فساد کا وبال بھی ان پر پڑتا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انما اعمالکم عمالکم (تمہارے حکمران تمہارے اعمال ہی کا پرتو ہوتے ہیں) لہذا لوگ حریت کو گنوا بیٹھتے ہیں اور وہ نعمت خلافت سلب ہو جاتی ہے جو قسط اور حریت کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور جس کی بدولت ان کو خدا کی حکومت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی جگہ انہیں غالب آنے والے کی اطاعت کی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

اس طرح غلبہ پانے والے جابر پہلا کام جو کرتے ہیں وہ یہ ہوتا ہے کہ امت اور اس کے اولوالامر سے امیر کے انتخاب کا حق سلب کر لیتے ہیں۔ اس طرح خلافت باطل ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ملوکیت آ جاتی ہے۔ ملوکیت اگرچہ خلافت کی نسبت ایک حقیر طرز حکومت ہے تاہم یہ انارکی سے بدرجہا بہتر ہے۔ پھر یہ نظام ایک غیر صالح امت کی مصلحت کے نقطہ نظر سے بھی بہت اچھا ہے کیونکہ اولوالامر کے نہ ہونے کی شکل میں لوگ کسی کے پیچھے نہیں چلتے اور ہر شخص صرف اپنی ذاتی رائے ہی کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی سنت ہوتی ہے کہ ان لوگوں پر ایک بادشاہ مقرر کر دے جو اگرچہ جابر ہو مگر لوگوں کو فساد فی الارض سے روک سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سمجھدار لوگ اس نظام حکومت سے بھی خوش ہوتے ہیں اور اس کے مطیع رہتے ہیں۔ اسی بات کا حکم ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے بھی دیا ہے ........

... ایک غیر صالح امت کے اندر صالح افراد کا وجود بھی کچھ عجیب نہیں۔ یہ لوگ جہاں تک ممکن ہو حالات سدھارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں لیکن غیر صالح امت کے اندر کبھی کوئی بادشاہ ایسا بھی آ جاتا ہے جو صالح اور متقی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی ہی رائے کو نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ کیونکہ امت اپنی حریت کو پہلے ہی کھو چکی ہوتی ہے۔ اس طرح کے بادشاہوں کی مثالیں جیسے حضرت سلیمانؑ اور ذوالقرنین کی شخصیات میں ملتی ہیں جن کا تذکرہ قرآن نے بھی کیا ہے۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ برائی کا منبع جمہور کے اخلاق کا فساد ہے۔ یہ فساد جب زیادہ ہو جاتا ہے تو پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس وجہ سے عوام کی اصلاح کرنا واجب ہے اور یہ ضروری ہے کہ بڑی محنت کے بعد ہی عمومی کام سے عزلت گزینی اختیار



کی جائے اور وہ بھی صرف کچھ مدت کے لئے ہو جس کے بعد کوئی دوسرا طریقہ اپنایا جا سکے۔

## خلیفہ کے اوصاف

خلیفہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ معاملات کی تفصیل میں تمام لوگوں سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو بلکہ اسے سب سے زیادہ راست رو اور حق کو پہچاننے والا ہونا چاہیئے اس کی حیثیت ہو بہو عقل کی ہوتی ہے جسے کلیات تو سب معلوم ہوتے ہیں مگر جزئیات کو صرف حواس ہی کے ذریعے جان سکتی ہے حالانکہ حواس کو معاملات کے کلیات کی کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ اس لئے عقل ہی حاکم اور عالم قرار پاتی ہے۔ خلیفہ کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات) — بے شک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقتوں کو سب سے زیادہ جاننے والا بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن میں ارشاد ہے:۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ — اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرنے والے تو علماء ہی ہیں

باقی امت کے مقابلے میں اسے اپنے اندر کوئی فضیلت نظر نہیں آتی بلکہ وہ اپنے آپ کو ان سے حقیر سمجھتا ہے لیکن دوسری طرف عزم کے اعتبار سے وہ سب سے قوی ہوتا ہے کیونکہ اس کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ وہ حق کو تلاش کرنے اور اس کی حمایت کرنے میں کبھی تذبذب نہیں دکھاتا۔ وہ اپنی انکساری اور خدا خوفی کی وجہ سے حکومت کی طلب دل میں نہیں رکھتا بلکہ یہ کام اسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے تو اپنی پوری کوشش عدل و انصاف کو رائج کرنے میں ......... صرف کر دیتا ہے۔ وہ معاملات میں لوگوں سے مشورہ کرتا ہے ایک تو اس لئے کہ صاحب عقل لوگوں کی رایوں سے فائدہ اٹھائے، دوسرا اس لئے کہ لوگوں سے یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ ہر صاحب علم سے بڑھ کر بھی کوئی نہ کوئی جاننے والا موجود ہے۔ مشورہ کے بعد جب حق اس پر واضح ہو جاتا ہے تو پھر کوئی چیز اسے اس حق سے پھیر نہیں سکتی۔ جہاں تک رؤساء کے باہمی اختلاف کا تعلق ہے یہ ان کے اندر تقویٰ کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی رائے سب سے زیادہ بلند معلوم ہوتی ہے اور ہر ایک یہ گمان کرتا ہے کہ وہی سب سے افضل ہے۔ چنانچہ وہ سب طلب ریاست کی جدوجہد میں لگ جاتے ہیں۔

## خلافت کی بنیاد عہد پر ہے

چونکہ نظام خلافت کے پیش نظر لوگوں کو متحد کر کے ایک وحدت بنا دینا ہوتا ہے تاکہ ان سب کے دل ایک ہو جائیں، ان کی تمام تر

(باقی بر صفحہ ۴۹)

مقالات

اسرار احمد

# ہنگامۂ عید

## ایک لمحۂ فکریہ

علامہ اقبال مرحوم تو یہ حسرت ہی لئے اپنے رب کے پاس پہنچ گئے کہ ان کی عید — "عید محکوماں ہجوم مومنین" کے بجائے "عید آزاداں شکوہ ملک و دیں" ہو! لیکن پوری پاکستانی قوم اس اعتبار سے کچھ زیادہ ہی بدنصیب واقع ہوئی ہے کہ آزادی کے بعد بجائے اس کے کہ اس کی عید "شکوہ ملک و دیں" کا مظہر بنتی الٹی "انتشار ملک و دیں" کی علامت بن کر رہ گئی اور اس سال یہ معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا جبکہ "حکومتِ ملک" ایک طرف اور "رجالِ دین" دوسری طرف ایسے مورچہ بند ہوئے کہ انتشار و افتراق کی حد ہو گئی — حتیٰ کہ اکثر لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ — "اس سال عید ہوئی ہی نہیں!"

"دین" کے کچھ "نادان دوست" اس صورتِ حال پر بغلیں بجا رہے ہیں کہ اس سال حکومت کو شکست ہو گئی اور پورے ملک میں ان تمام لوگوں نے جنہیں دین سے ذرا سا بھی لگاؤ اور تعلق ہے علماء کے فتوے پر عمل کیا، اور اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اس ملک کے عوام دین کے معاملے میں حکومت کے بجائے کلیتہً علماء پر اعتماد کرتے ہیں — ہماری رائے میں یہ "مسرت" سوائے اس کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ غالباً یہ حضرات بہت ہی شدید احساسِ شکست کا شکار ہیں۔ ورنہ وہ آفتاب کے وجود کے ثبوت کے لئے خود آفتاب ہی کو دلیل بناتے اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے اثر نہ لیتے — یہ بات کہ پاکستان کے مسلمان دین کے معاملے میں اصل اعتماد علماء ہی پر کرتے ہیں اور دوسرے کسی بھی ادارے کو ان کے مقابلے میں قابلِ استناد نہیں جانتے، ایک پہاڑ جیسی حقیقت ہے اور اس کے ثبوت کے لئے اس قسم کے ادنیٰ مظاہروں سے استناد کی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہے!

البتہ ایک دوسرا پہلو جو ہماری رائے میں ان حضرات کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور جس کی طرف توجہ مبذول کرانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں یہ ہے کہ اس قسم کے مظاہرے ان جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو دین سے بیزار اور متنفر کرنے کا سبب بن رہے ہیں جن کی تعلیم و تربیت مغربی طرز پر ہوئی ہے۔ یہ لوگ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یقیناً ایک حقیر اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن انہی کے ہاتھ میں اس ملک کی زمامِ کار اور تمام معاملات کی باگ ڈور ہے اور وہی اس کے تمام انتظام و انصرام کے ذمہ دار اور اس کی پوری اجتماعی زندگی کے جوابدار ہیں۔ ان کی ایک بہت بڑی اکثریت دین سے ناواقف ضرور ہے لیکن یہ خیال کر کے کہ یہ



دین کے دشمن ہیں ان کے ساتھ شدید ناانصافی ہی نہیں بلکہ خود دین اور اس ملک میں اس کے مستقبل کے اعتبار سے پرلے درجے کی کوتاہ بینی اور ناعاقبت اندیشی ہے! — دین سے ان کا بُعد براہِ راست نتیجہ ہے اس مخصوص ماحول کا جس میں وہ پلے بڑھے ہیں اور اس نظامِ تعلیم کا جس کے تحت انہوں نے علوم و فنون کی تحصیل کی ہے — اور ہر اس شخص یا جماعت کے لئے جسے اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے ساتھ کچھ بھی مخلصانہ دلچسپی ہو یہ لازمی ہے کہ وہ ہر ممکن ذریعے سے اس بُعد کو کم سے کم تر کرنے کی کوشش کرے اور خصوصاً ایسی ہر صورت سے حتی الامکان اجتناب و احتراز کرے جس سے اس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو!

---

ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال کسی طرح خوش آئند قرار نہیں دی جا سکتی کہ اس معاملے میں "حکومتِ ملک" اور "رجالِ دین" نے دو مخالف کیمپوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک طرف حکومت کے ذمہ دار افسروں، برسرِ اقتدار جماعت کے زعماء اور پریس ٹرسٹ کے اخبارات نے اس مسئلے پر بیان بازی اور مضمون نگاری کو ایک مستقل مشغلہ بنا لیا۔ اور وہ سارا الزام علماء کو دیتے رہے — اور دوسری طرف علماء دین اور مذہبی سیاست کے علمبردار اپنے موقف کو درست ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اور جو کچھ ہوا اس کی پوری ذمہ داری انہوں نے حکومت پر ڈال دی۔

ہمارے نزدیک یہ سوال کہ جو کچھ ہوا اس کی اصل ذمہ داری کس پر ہے۔ اول تو ہے ہی نہایت غیر اہم اس سے کہیں زیادہ غور و فکر کا مستحق امر یہ ہے کہ آئندہ اس مسئلے کا حل کیا ہو اور ایسی صورتِ حال کا تدارک کیسے کیا جائے — دوسرے اس کا صحیح تعین کہ اس کے پیچھے کون کون سے عوامل اور محرکات کام کر رہے تھے ہے بھی بہت مشکل — اور خصوصاً اس وقت تو ذہنی تعصب اور گروہی عصبیت کے غلو کے بغیر ناممکن ہے کہ اس معاملے کی پوری ذمہ داری کسی ایک فریق پر ڈال دی جائے۔

بادی النظر میں جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اولاً حکومت کی اس کوتاہی کو دخل ہے کہ اس نے [illegible] بنیاد پر رویتِ ہلال — کا کوئی ایسا بندوبست کیا کہ شہادتِ شرعی کے قیام کا امکان ہو سکتا — اور نہ ہی مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی میں عوام کے معتمد علیہ علماء کو مناسب نمائندگی دی۔ پھر ایک مزید غلطی یہ ہوئی کہ ریڈیو پر رویتِ ہلال کا پہلا اعلان بالکل مجمل اور غیر تسلی بخش تھا، اور جب تک دوسرا اعلان ہوا، اول تو اس وقت تک بے چینی اور بے اطمینانی کی لہر پورے ملک میں دوڑ چکی تھی اور اعلان خود بھی قدرے مفصل ہونے کے باوجود پوری طرح اطمینان بخش نہ تھا — دوسری طرف واقعہ یہ ہے کہ علماء کے طرزِ عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ پہلے سے سخت غیر مطمئن تھے اور عدمِ اطمینان کے اظہار

کے لئے انہیں کچھ وجوہ کی ضرورت تھی جو بروقت پوری ہو گئی ___ ہماری رائے میں نہ حکومت کے ذمہ دار لوگوں کی نیت میں خلل اور فتور قرار دینے کے لئے کوئی وجہ جواز موجود ہے اور نہ ہی ملک کے پورے طول و عرض میں ہر طبقۂ فکر کے علماء کے فوری (SPONTANEOUS) اور یکساں ردِ عمل اور متفقہ فیصلے کے پیشِ نظر یہ سمجھنے کے لئے کوئی بنیاد موجود ہے کہ اس کی پشت پر کوئی سازش کام کر رہی تھی ___ حکومت کے ذمہ دار لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے سہل انگاری اور بے پرواہی سے کام لیا ___ اور علماء کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے عوامی عدم اطمینان کو ظہور و خروج کا ایک موقع مل گیا ___ اس سے زیادہ کچھ کہنا ہماری رائے میں حدود سے تجاوز ہے ___ اور جو کوئی بھی ایسا کرے قطع نظر اس سے کہ وہ اربابِ اقتدار کا ترجمان ہو یا طبقۂ علماء کا نمائندہ ___ وہ خواہ مخواہ حکومت اور علماء کے مابین خلیج کو وسیع و عمیق کرنے کے درپے ہے ___ اور اسے کسی بھی طرح ملک و ملت کی خیر خواہی قرار دیا جا سکتا ہے نہ دین کی ___!

اس سلسلے میں ہم حکومتِ پاکستان اور علمائے کرام دونوں کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

صدر ایوب اور حکومتِ پاکستان کے ذمہ دار افسروں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ آپ حضرات ان معاملات میں ملک کی عظیم اکثریت کے احساسات و جذبات کا مناسب حد تک لحاظ رکھیں اور ان مسائل کو کم از کم اتنی اہمیت ضرور دیں جس کی وہ واقعتہً مستحق ہیں ___ اگر کسی وجہ سے آپ کے نزدیک یہ مسائل غیر اہم ہوں یا زندگی کے وسیع تر حقائق اور ملک و ملت کے اہم تر مسائل کے مقابلے میں آپ کو غیر اہم نظر آئیں تب بھی یہ حقیقت تو مسلّم ہے کہ ملک کے عوام کے نزدیک یہ ان کے دین کا معاملہ ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے ___

لہٰذا اس مسئلے میں آپ کو چاہئے کہ ضلعی سطح پر بھی رؤیتِ ہلال کا ایسا بندوبست کریں کہ شہادتِ شرعی کے قیام کا اطمینان ہو سکے ___ اور مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی میں بھی ملک کے مختلف دینی فرقوں کے معتمد علیہ علماء کو مناسب نمائندگی دیں ___ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ آپ کو اس کا حق حاصل ہوگا بلکہ ہماری رائے میں یہ ضروری بھی ہوگا کہ آپ اپنے فیصلے کو جبراً نافذ کریں اور اس کی خلاف ورزی کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیں ___ لیکن اگر کسی وجہ سے آپ اس کھکھیڑ میں نہیں پڑنا چاہتے تو پھر بہتر یہ ہے کہ آپ اس معاملے کو کلیۃً عوام اور ان کے علماء کے حوالے کر دیں۔ عید کی تعطیلات دو ہی نہیں تین بھی کی جا سکتی ہیں، پھر لوگ جانیں اور ان کے معتمد علیہ علماء ___ چاہے وہ ایک عید کریں، چاہے دو یا تین، حکومت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی،

___ یا پھر کل یا پرسوں!



علمائے کرام کی خدمت میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ ہمیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم آپ پر جرح کریں اور پھر پاسِ ادب بھی مانع ہے، تاہم دین اور اس ملک میں اس کے مستقبل سے دلچسپی کی بنا پر ہم آپ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہیں کہ

کیا آپ کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ آپ اس معاملے کو خالص قانونی نقطۂ نظر سے دیکھتے ___ کہ ایک مسلمان مملکت میں جس کے حکمران بھی مسلمان ہیں (چاہے کسی کے نزدیک وہ کتنے ہی فاسق و فاجر ہوں!) حکومت کے مقرر کردہ ذمہ دار ادارے کی جانب سے اس اعلان پر کہ عید کا چاند ہو گیا ہے ___ غلط و صواب کی ساری ذمہ داری اور عذاب و ثواب کا پورا بوجھ انہی پر چھوڑتے ہوئے عید منالی جاتی ___ اور بعد میں اگر وثوق کے ساتھ یہ معلوم ہوتا کہ ایک روزہ رہ گیا ہے تو اس کی قضا دے دی جاتی؟ ___

کیا واقعتہً اس معاملے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی جو حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں ___ جن میں سے ایک میں حضرت ابوذرؓ یہ فرماتے ہیں کہ

"إِنَّ خَلِيلِي أَوْصَانِي أَنْ أَسْمَعَ وَأُطِيعَ وَإِنْ كَانَ عَبْدًا مُجَدَّعَ الْأَطْرَافِ وَأَنْ أُصَلِّيَ الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا فَإِنْ أَدْرَكْتَ الْقَوْمَ وَقَدْ صَلَّوْا كُنْتَ قَدْ أَحْرَزْتَ صَلَاتَكَ وَإِلَّا كَانَتْ لَكَ نَافِلَةً" (صحیح مسلم)

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں "میرے دوست نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں صاحبِ امر کی بات مانوں اور اس کی اطاعت کروں اگرچہ وہ ایک اعضا بریدہ غلام ہو۔ اور نماز کو اس کے وقت پر ادا کروں، پھر اگر تو لوگوں کے نماز پڑھ چکنے کے بعد پہنچے تو تو پہلے ہی اپنی نماز محفوظ کر چکا ہوگا ___ ورنہ ان کے ساتھ تیری نماز نفل ہو جائے گی"

برادرانِ عزیز! ___ ہم سب اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہم لوگ خود اپنے نجی و ذاتی مسائل اور اپنے اپنے حلقے کے لوگوں کے معاملات میں آسانی اور یُسر پیدا کرنے کے لئے شریعتِ اسلامی کی کن کن گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ___ اور قانون کی کن آخری حدود تک توسع کی سعی کرتے ہیں! ___ تو کیا ضروری تھا کہ اس معاملے میں فتوے کی بجائے تقوے ہی کو عمل کی بنیاد بنایا جاتا؟ ___ کیا ملی یکجہتی اور قومی اتحاد کی قدر آپ حضرات کی نگاہوں میں افراد کی نجی مصلحتوں اور ضرورتوں سے بھی کم ہے ___؟ رؤیتِ ہلال کے سرکاری انتظامات میں جتنے سقم تھے وہ سب پہلے ہی سے معلوم تھے ___ تو یا تو آپ کو چاہئے تھا کہ پہلے ہی سے عوام کو خبردار کر دیتے ___ اور خود اپنے طور پر رؤیتِ ہلال کی شہادتوں کے بہم پہنچانے، فیصلے پر بروقت پہنچنے اور مناسب وقت تک اس کے اشتہار و اعلان کا بندوبست کرتے ___ یا اگر ان تمام اہتمام کے

باوجود آپ کے نزدیک رویتِ ہلال کا سرکاری انتظام — کراہت کے باوجود — بہر حال قابلِ قبول تھا — تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کے اعلان کے بعد آپ نے خواہ مخواہ کے تجسس اور چھان بین کی تکلیف کیوں گوارا کی — دراں حالیکہ یہ کام نہ آپ کے ذمے تھا اور نہ آپ اس کے لیے تیار تھے؟

ہمیں تسلیم ہے کہ آپ دین کے معاملے میں حکومت کے طرزِ عمل کی وجہ سے بالعموم اور بجا طور پر غیر مطمئن ہیں لیکن خدارا اس امر کی اہمیت کا احساس فرمائیے کہ ہم چاہیں آپ پورا اختیار رکھیں اور غیر دلدہی، مبادا ہماری یہ بے اطمینانی بے قابو ہو کر ایسی صورتیں پیدا کر دے جو دین کے لیے مفید ہوں نہ ملک و ملت کے لیے — سیاسی بے اطمینانی کے لیے تو عوام کی بے چینی اور بے اطمینانی چاہے وہ کسی سبب سے ہو بجائے خود ایک رحمت ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتی ہیں کہ ایسے مواقع پیدا ہوں جن پر عوام کو برسرِ اقتدار لوگوں کے خلاف مشتعل کیا جا سکے — لیکن خدا ہمیں اس سے بچائے کہ ہم دین اور دینی مسائل کو بھی گروہی سیاست میں استعمال کرنا شروع کر دیں، اس کے برعکس ہمیں چاہیے کہ اپنی تمام توجہات اس مقصد کی کوشش پر مرکوز کر دیں کہ مسائل حل ہوں — اور باہمی اختلاف کی فضا ہموار ہو۔

اس سلسلے میں ہم علمائے کرام کی خدمت میں یہ گزارش بھی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور مندرجہ ذیل دو امور پر کسی متفق علیہ نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں:

ایک یہ کہ کیا دین میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ بجائے رویتِ بصری کے قمری تقویم ہی کی بنیاد پر عید منائی جائے؟ — اس سلسلے میں جو ایک بات عوام میں مشہور ہو گئی ہے کہ اکثر عرب ممالک اور بعض دوسرے مسلمان ممالک میں اسی پر عمل ہے تو تحقیق کرنی چاہیے کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ — اور اگر ایسا ہے تو معلوم کرنا چاہیے کہ وہاں کے علماء کے پاس اس کے حق میں کیا دلائل ہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر رویتِ بصری ہی لازمی ہے تو کیا ملک میں کسی ایک مقام پر رویتِ ہلال کی شرعی شہادت کی بنا پر فاصلوں اور طولِ بلد اور عرضِ بلد کا لحاظ کئے بغیر پورے ملک میں عید منائی جا سکتی ہے؟ — اور اگر اس کا جواب نفی میں ہو تو طے کرنا چاہیے کہ ایک مقام کی رویت کتنے فاصلے تک حجت ہوگی (اس سلسلے میں پاکستان کے مشرقی و مغربی حصوں کا بُعد خصوصاً غور طلب ہے)۔

علمائے کرام کا کسی بھی وقت پر ایک متفق علیہ موقف پر متفق ہو جانا خواہ کتنا ہی خوش آئند نظر آئے، دین کا معاملہ کسی چیز میں ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مسئلے کے مثبت حل پر ان کا اجماع ہو اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکے تو ہم کس منہ سے عوام کو ..... وضاحت کر سکتے ہیں مگر ان کی زبانوں پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ عام ہو جائے کہ ع

دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد!



اسرار احمد

# طلباء کے مسائل اور ان کا حل

[یہ تقریر اسلامی جمعیتِ طلبہ پاکستان کے چھٹے سالانہ اجتماع کے موقع پر کراچی میں [illegible] نومبر [illegible]ء کی شام جہانگیر پارک میں منعقدہ ایک اجلاسِ عام میں کی گئی۔ اس اجلاس کی صدارت جناب عمر حیات ملک صاحب سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے فرمائی۔]

صاحبِ صدر! بزرگو اور دوستو — میری آج کی گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ طلبہ کے اصل مسائل کیا ہیں اور انہیں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔

## طلبا کے مسائل کا خطرناک تصور

اس سلسلے میں سب سے پہلے میں آپ حضرات کو یہ بتاؤں گا کہ طلبہ کے مسائل کا وہ تنگ نظرانہ تصور جو عام طور پر رائج ہے کس درجہ خطرناک اور ملک و ملت کے حق میں کتنے برے نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ پھر میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہمارے اصل اور واقعی مسائل کیا ہیں اور ان کے حل کی صحیح صورت کیا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ طلبہ کے مسائل کے بارے میں عام طور پر جو باتیں کہی اور سنی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ

کالج کم ہیں، داخلہ نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو ہیں ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ تعلیم بے حد مہنگی ہے اور جو چیز ایک نادار ملک میں مفت ملنی چاہیے اس کی ہمارے ملک میں بہت گراں قیمت وصول کی جا رہی ہے۔ امتحانات کا نظم ٹھیک نہیں ہے۔ سپلیمنٹری امتحانات نہ ہونے سے ہر ایک طالب علم کے ایک سال کے ضیاع کا خطرہ ہوتا ہے۔ وظائف کم ہیں اور جو ہیں ان سے استفادہ کی شرائط انتہائی کڑی ہیں۔

یہ اور اسی طرح کے بہت سے مسائل ہیں جنہیں طلبہ کے مسائل کا نام دے کر یہاں وہاں پکارا جاتا ہے اور ان معاملات میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل کرنے کو طلبہ کی سعی و جہد کا مقصود قرار دیا جاتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر کوئی اس سے بڑھ کر ملک و ملت کے مسائل کی طرف طلبہ کی توجہ کو منعطف کرانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لئے بلا تکلف طلبہ کے نصب العین کے دشمن کا خطاب استعمال کر دیا جاتا ہے۔

ہماری رائے میں طلبا کے مسائل کا یہ محدود تصور انتہائی تنگ نظرانہ ہے اور ان مسائل کو طلبہ کا نصب العین قرار دے کر اس کے لئے جدوجہد کرنا انتہائی خطرناک ہے۔

جب ہم اس رائے کا اظہار کرتے ہیں تو سب سے پہلی بات جو پیش نظر رہنی چاہئیے۔ وہ یہ ہے کہ ہم خود طلبہ ہیں۔ اور جن مشکلات کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ان میں دوسرے طلبہ کی طرح ہم خود بھی پوری طرح گرفتار ہیں یہ بات اگر حکومت اور نظام تعلیم کے ارباب بست وکشاد کی طرف سے کہی جاتی تو کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ طالب علم اس پر کان دھریں۔ لیکن جب ان کے کچھ طالب علم ساتھی ہی اس رائے کا اظہار کر رہے ہیں تو دوسرے طلبہ کو چاہئیے کہ وہ ان کے لئے جو تلخ حکومت کے ایجنٹ کا خطاب استعمال کرنے سے قبل ان کی باتوں کو سنیں اور ان پر غور کریں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ طلبہ کے مسائل کا یہ تصور تنگ نظرانہ ہے۔ تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ یہ وہ مشکلات ہیں جن میں طلبا گرفتار ہیں۔ اور ملک وقوم کی فلاح و بہبود کا واقعی تقاضا یہ ہے کہ ان کو دور کیا جائے۔ لیکن فی الواقع انہیں طلبہ کے مسائل کا عنوان دے کر اپنی نگاہوں کو انہی تک محدود کر لینا انتہائی تنگ نظری ہے ۔۔ ہم طالب علم ایک ملک میں بسنے والے مجموعہ افراد کا ایک حصہ اور ایک قوم کی مستقبل کی تعمیر ہیں۔ ہمارے اصل مسائل وہی ہیں جن میں ہمارا ملک گرفتار ہے اور جو ہماری قوم کو گھیرے ہوئے ہیں ملک کے نصب العین سے مختلف ہمارا کوئی نصب العین اور قوم کے مسائل سے علیحدہ ہمارے کوئی مسائل نہیں ہیں۔ ہماری نگاہوں کو اس قدر تنگ نہیں ہونا چاہئیے کہ ان میں بس اپنی چند مشکلات ہی سما سکیں بلکہ انہیں اس قدر وسیع ہونا چاہئیے کہ وہ ملک وقوم کے تمام مسائل پر محیط ہوں اور اپنی مشکلات کو بھی انہی کے نقطۂ نظر سے جانچیں اور پرکھیں۔

پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی مشکلات کے لئے سٹوڈنٹس کاز (STUDENTS CAUSE) کا نعرہ بلند کرکے کسی جدوجہد کا آغاز کرنا خطرناک ہے۔ تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ طریق کار نہ صرف یہ کہ ان مشکلات کے حل کرنے میں مدد اور معاون نہیں ہے بلکہ بہت سے ایسے ناخوشگوار اور تلخ احساسات کو جنم دیتا ہے جو ہمارے ملی اور ملکی استحکام کی جڑوں کو اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح چاٹ سکتے ہیں۔

اوّل تو جب آپ سٹوڈنٹس کاز کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو گویا اعلان کرتے ہیں کہ طلبا بقیہ قوم سے علیحدہ ایک طبقہ ہیں۔ ان کا مفاد دوسرے طبقات سے متصادم ہے۔ طبقاتی کشمکش کا وہ احساس جو اس طرح پیدا ہوتا ہے ملی و ملکی استحکام کی جڑوں پر ایک تیشہ بن کر گرتا ہے۔ یہی وہ طریق فکر ہے جو قوم میں ایک طرف [illegible] کی تفریق سرمایہ و محنت کی شکل میں کرتا ہے اور وہاں طبقاتی تصادم پیدا کرتا ہے ۔۔ یہی طلبہ کو ایک طرف حکومت اور نظام تعلیم کے ارباب بست وکشاد کو دوسرا طبقہ بنا کر انہیں ٹکراتا ہے ۔۔ سب ظاہر ہے کہ جہاں



یہ طبقاتی تصادم پیدا ہو جائے۔ وہاں بدامنی۔ بے چینی [illegible] اور جھگڑوں کا پیدا ہونا [illegible] سکتا ہے [illegible]

پھر اس طرح طلبہ اور حکومت اور نظام تعلیم کے ارباب کار کو مقابل کی صفوں میں کھڑا کرنے کے بعد مشکلات کے امن پسندانہ حل کی توقع رکھنا بھی حماقت ہے۔ مشترک مفاد اور مشترک مقصد کو درمیان سے نکال کر آپ ان کو ایک دوسرے کا مدمقابل بنا دیتے ہیں۔ اور اس طرح گفت وشنید اور افہام وتفہیم کے تمام راستے بند کر دیتے ہیں ۔۔ پھر ایک ہی راہ ہے کہ طلبہ اپنی قوت کے اظہار کے لئے ہڑتالیں کریں اور جلوس نکالیں اور حکومت اپنے وقار کے بت کی پوجا کرتے ہوئے گولیاں برسائے اور لاٹھیاں چلائے ۔۔ ایک دوسرے کی مشکلات کو پیش نظر رکھ کر ایک دوسرے کی شکایات پر ہمدردانہ غور کرنے کے رویہ کو ترک کرنے کے بعد اور ایک ہی قوم کے حصے اور ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہونے اور ایک مشترک مفاد اور ایک مشترک مقصد رکھنے کے تصور کو خارج از بحث کرنے کے بعد یہی ایک شکل رہ جاتی ہے ۔۔ تجربہ شاہد ہے کہ جہاں بھی اس طریق کار پر عمل کیا گیا یہی نتائج نکلے اور اب جہاں بھی اس طریق کار کو اپنایا جائیگا ۔۔ ذہن چاہتا ہے اور عقل مطالبہ کرتی ہے کہ ٹھیک یہی بلکہ اس سے کہیں خراب نتائج رونما ہوں۔

یہ وہ حقائق ہیں جو صرف دعوؤں کی بناء پر نہیں ہیں بلکہ اپنی پشت پر تجربات کا وزن بھی لئے ہوئے ہیں جن کی بناء پر ہم یہ کہتے ہیں کہ طلبہ کے مسائل کا یہ تصور تنگ نظرانہ اور اس کے حصول کو نصب العین بنا کر ایک جدوجہد شروع کرنا خطرناک ہے۔

### ہمارا حقیقی مسئلہ

اب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہمارا اصل مسئلہ کون سا ہے۔ اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ میں ایک بات کہہ دوں میں چاہتا ہوں کہ آپ خود سوچ سمجھ کر ایک نتیجہ پر پہنچیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ذرا یہ سوچئے کہ کسی ملک اور کسی قوم کے نوجوان طلبہ اس ملک اور اس قوم کی اجتماعی زندگی میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ مختصر ترین الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک اور قوم کا مستقبل ان نوجوان طلبہ ہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اس کی اچھائی اور برائی کا تمام تر انحصار طلبہ ہی پر ہوتا ہے انہی کے ہاتھوں میں قوم کے مستقبل کی باگیں ہوتی ہیں کہ جدھر چاہیں موڑ دیں اور وہی ملک کے مستقبل کے بارے میں اصل فیصلہ کن طاقت ہوتے ہیں۔ چاہیں تو اسے عزت و سربلندی کے ساتویں آسمان تک پہنچا دیں اور چاہیں تو ذلت اور گمنامی کے گہرے غاروں میں جا گرائیں۔

چونکہ میری آئندہ گزارشات کا انحصار اسی ایک بات کے سمجھ لینے پر ہے اس لئے میں اس سلسلے میں ذرا تفصیل میں جانا پسند کروں گا۔

طلبا ایک تمدن کے وارث ہیں۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ ہر قوم اپنا ایک ماضی رکھتی ہے جو اسے جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے جس کے بقا پر اس کے قومی تشخص کے بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ وہ علوم میں اپنا ایک نقطۂ نظر — فنون میں اپنا ایک مزاج اور فلسفے اور عمرانیات میں اپنی ایک ڈگر رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کی آئندہ نسلیں نہ صرف یہ کہ اسی ڈگر پر چلیں بلکہ اس میں مزید ترقی کریں — ظاہر بات ہے کہ یہ تمام کام اس قوم کے نوجوان طلبہ ہی کا ہوتا ہے کہ وہ اس قوم سے جو تمدن جو تہذیب اور جو کچھ ورثہ میں پائیں اسے زندہ رکھیں اور آنے والی نسلوں کو منتقل کریں — اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر قوم اپنی کچھ اجتماعی خواہشات اور مجموعی ارادے اور مقاصد رکھتی ہے اور یہ اس قوم کے نوجوان طلبہ ہی کا کام ہے کہ وہ ان اجتماعی خواہشات کو پورا کریں، اور مجموعی ارادوں اور مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔

**طلبہ ملکی استحکام کے محافظ** — اسی طرح کسی ملک کے استحکام اور بقا کا انحصار بھی اس کے نوجوان طلبہ ہی پر ہوتا ہے۔ انہی کو آگے بڑھ کر ملک کی انتظامی مشینری کو چلانا ہوتا ہے۔ انہی کو ملک کی آزادی کا ضامن بننا ہوتا ہے۔ یہی ہوتے ہیں کہ جو ملک کے دفاعی حصار کے مورچوں کا چارج لیتے ہیں۔ انہی کے ہاتھوں سے ملک کی تقدیر لکھی اور مٹائی جاتی ہے۔ یہی چاہیں تو ملک کو اوج ثریا تک لے جائیں اور چاہیں تو تحت الثریٰ میں پہنچا دیں۔

لہٰذا آپ میری بات سے پوری طرح متفق ہوں گے اگر میں کہوں کہ کسی قوم کے طلبہ کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح تیار کریں کہ وقت آنے پر قوم کے ماضی کے علم بردار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ اس کے تمدن اور اس کے کلچر کے ترجمان ہوں اس کے علوم و فنون اور اس کے فلسفے اور آرٹ کو دنیا میں پھیلا سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مجموعی خواہشات اور اس کے اجتماعی ارادوں اور مقاصد کی تکمیل کر سکیں — اور کسی ملک کے طلبہ کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس طور پر تیار ہوں اور ایسی ٹریننگ حاصل کریں کہ جب وہ اس ملک کا کاروبار سنبھالیں تو ایک طرف اس کی آزادی کے ضامن بن سکیں اور اس کے دفاع و استحکام کی ذمہ داری لے سکیں اور دوسری طرف اس کی انتظامی مشینری کو بہتر طریق پر چلا سکیں اور دنیا میں اس کی نیک نامی کا باعث ہوں۔

یہ کسی ملک اور کسی قوم کے نوجوان طلبہ کا اصل مسئلہ ہوتا ہے — کہ جس پر ان کی نگاہوں کو مرکوز اور ان کی تمام کوششوں اور قوتوں کو مرکوز ہونا چاہئے۔

**غور و فکر کا مقام** اب میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اسے پیش نظر رکھ کر آپ سنجیدگی سے اپنے بارے میں سوچیں کہ آپ کا اصل مسئلہ کون سا ہے:

★ قومیت کے اعتبار سے آپ امت مسلمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

● اس امت کے بارے میں کوئی غبی ہی ہو گا جو یہ نہ جانتا ہو کہ اس کی بنیاد نہ وطن پر ہے۔ نہ



نسل پر — نہ نسل پر ہے نہ زبان پر بلکہ دین پر ہے جس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو ایک خاص نظریہ [illegible] ہی پر مبنی ہے۔

● پھر یہ بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قوم کا ایک مخصوص نظریہ کائنات و انسان ہے جو دنیا کے دوسرے تمام نظریات سے مختلف ہے۔ علوم میں اس کا اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ جو دوسرے تمام نقطہ ہائے نظر سے علیحدہ ہے۔ فنون میں اس کا اپنا ایک مزاج اور فلسفے اور عمرانیات میں اس کی اپنی ایک ڈگر ہے۔ اس کا اپنا ایک تمدن ہے۔ یہ اپنا ایک مخصوص کلچر رکھتی ہے۔ اور ان تمام چیزوں میں ایک نوعیت وحدت کی انفرادیت کی حامل ہے۔

● پھر اس کے مجموعی ارادوں اور اجتماعی مقاصد کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا کہ یہ قوم بس ایک قوم کی طرح ان تمام چیزوں کو اپنی ذاتی ملک سمجھ کر خاموش بیٹھنے والی نہیں ہے۔ بلکہ وہ کہتی ہے کہ یہ اللہ کا دین ہے جس کی میں علم بردار ہوں۔ جس کو دنیا میں پھیلانا میرا مقصد وجود ہے اور جسے دنیا میں قائم کرنا میری زندگی اور ایمان کا عین تقاضا ہے۔

ان حالات میں سوچئے کہ آپ کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ کیا آپ مجھے دہرانے پر بھی غلط بیانی کا الزام دیں گے۔ اگر میں کہوں کہ ہمارا اصل مسئلہ دنیا میں اسلامی فکر کے داعی نظریہ اسلامی . . . . . . کے علمبردار اور اللہ کے دین کے فوج در فوج بن کر کھڑا ہونا اور عالمگیر اسلامی انقلاب کی تکمیل میں اپنی قوتوں کو صرف کرنا ہے۔ جس قوت سے آپ اپنا تعلق جوڑتے ہیں اور جس قوم سے آپ اپنا رشتہ باندھتے ہیں اس کا آپ سے یہی مطالبہ ہے۔ اور اگر آپ نے یہی کام نہ کیا تو آپ اپنی قوم سے ایک بہت بڑی غداری کے مرتکب ہوں گے۔

★ پھر ملکی نقطۂ نگاہ سے بھی سوچ لیجئے۔

● آپ کا ملک اسلام کے نام ہی پر وجود میں آیا ہے۔ اسلام ہی تھا کہ جس کے لئے آپ نے برعظیم ہند کی تقسیم کو گوارا کیا۔ اسی کی خاطر آپ نے چار کروڑ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑنا منظور کیا۔ اسی کی خاطر آپ نے قربانیاں دیں۔ اسی کے لئے آپ نے گھر بار چھوڑا۔ عصمتیں لٹائیں اور خاک و خون میں لوٹنا پسند کیا۔

● پھر اسلام ہی آپ کے لئے ایک واحد چارہ کار ہے۔ اس کے بغیر آپ کے اتحاد کی کوئی شکل نہیں۔ پاکستان میں کوئی ایک قومیت نہیں بستی یہاں پر مختلف نسلی و لسانی قومیتیں آباد ہیں۔ اسلام کے رشتے کو بیچ میں سے نکال دیجئے تو پھر کوئی اور چیز آپ کو جوڑ کر رکھنے والی نہیں ہے۔ آپ کے اتحاد

کو اتحاد ملی اور اشتراک مقصد کی کوئی اور بنیاد موجود نہیں ہے۔ جاننے والے پہلے بھی جانتے تھے اور اب تو حالات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ اسلام کے سوائے آپ کے اتحاد کی اور کوئی سبیل موجود نہیں ہے۔ اسلام ہی ہے کہ جو آپ کے مختلف حصوں کو متحد اور مجتمع رکھنے کی صلاحیت اور قوت رکھتا ہے۔ جو آپ کو متحد کر کے ایک قوت بنا سکتا ہے جو آپ کو وحدت فکر اور اتحاد عمل کی نعمتوں سے مالامال کر سکتا ہے۔

پھر دنیا میں ہماری سربلندی اور عزت بھی اسلام ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اول تو اسلام کے بغیر آپ کا ایک قوم بننا ممکن ہی نہیں ہے تاہم بالفرض محال آپ کسی اور طریقے سے ایک منظم اور متحد قوم بن بھی جائیں تو دنیا میں پاکستان کی پوزیشن ایک ایسی چھوٹی سی قومی ریاست سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنے وجود کے لئے بڑی طاقتوں کی نگاہ کرم پر انحصار رکھتی ہو۔ اب دنیا میں ان چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں کا دور گذر چکا ہے۔ یہ نظریہ ہائے حیات کا دور ہے یہاں وہی زندہ رہے گا اور پھلے پھولے گا۔ جس کے پاس کوئی نظریہ ..... ہو اور وہ اس کا داعی بن کر کھڑا ہو سکے اور کہہ سکے کہ یہ ہے وہ چیز جو دنیا اور نوع انسان کے دکھوں کا مداوا بن سکتی ہے

اس نقطۂ نظر سے آپ کو محسوس کرنا چاہئے کہ آپ وہ خوش قسمت مجموعہ افراد ہیں جن کے پاس اللہ کا دین بن دمن موجود ہے۔ جس کا مقصد وجود ہی یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اس دین کے داعی اور علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور چونکہ اپنے اس فرض کو ادا کریں تو نہ صرف یہ کہ دنیا میں سربلندی اور سرفرازی ان کے قدم چومے گی بلکہ آخرت میں اللہ کا انعام و اکرام ان کا استقبال کرے گا۔

چنانچہ کسی نقطۂ نگاہ سے بھی سوچئے تو آپ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ کا اصل مسئلہ اقامت دین ہے۔ یعنی یہ کہ آپ پہلے پاکستان کو ایک مثالی اسلامی ریاست بنائیں اور پھر دنیا کے سامنے اللہ کے دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور نوع انسانی کو اس کی دعوت دے سکیں۔

ہماری نگاہ میں طلبا کا وہ اصل مسئلہ جس پر ہماری تمام توجہات کو مرتکز اور تمام کوششوں کو مرکوز ہونا چاہئے اور جس کا مطالبہ ہم سے ہماری قوم بھی کرتی ہے اور ہمارا ملک بھی اور جس پر ہماری دنیا کی بہتری کا بھی انحصار ہے اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی کا بھی وہ یہ ہے کہ

"ہم اللہ کے دین کو دنیا میں عملاً قائم کریں"

کہنے کو یہ بات میں پہلے ہی دو الفاظ میں کہہ سکتا تھا لیکن اس سے میرا مطلب اچھی طرح واضح نہ ہوتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارا اصل مسئلہ اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم یہ بات مذہبی جنون اور فرقہ پرستی کی رو میں کہہ رہے ہیں حالانکہ ہم اچھی طرح واقف



سے جانتے ہیں کہ یہی ہماری قوم کا مجموعی ارادہ ہے۔ اسی میں ہمارے ملک کی فلاح ہے اور یہی چیز ہماری عزت و نیک نامی کی ضامن اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

بہرحال میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ہماری نگاہ میں ہمارا اصل مسئلہ اللہ کے دین کا قیام ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ مسئلہ ملک کے عوام اور ارباب حکومت کا بھی ہے اور طلبہ کا بھی۔ اگرچہ حکومت، عوام اور طلبہ تینوں ہی اس کام میں برابر کے حصہ دار ہیں لیکن طلبہ اس معاملہ میں کچھ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نسل اپنی پوری نیک نیتی کے باوجود ان صلاحیتوں اور قوتوں سے عاری ہے جو اس کام کے لئے درکار ہیں۔ موجودہ نسل دور غلامی کی پیداوار ہے اور اپنے ذہنی و فکری ڈھانچے اور سیرت و کردار کے سانچے میں وہ تمام خرابیاں بدرجہ اتم لئے ہوئے ہے جو غلامی سے پیدا ہوتی ہیں — قوم کی تعمیر نو — اور دین کی اقامت کا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دور آزادی میں تربیت پا رہے ہیں۔ ان ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نئے نظام زندگی کی تعمیر صحیح بنیادوں اور صحیح طریقوں پر کر سکیں گے۔ لہٰذا اگرچہ یہ مسئلہ حکومت کا بھی ہے اور عوام کا بھی۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ اہم پارٹ اس کام میں آج کے طلبہ کو ادا کرنا ہے۔

## موجودہ ماحول کا جائزہ

اب آپ ان حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جن سے آج پاکستان میں ہم دو چار ہیں اور جن سے عہدہ برآ ہو کر ہی اسلامی انقلاب کی راہیں ہموار کر سکتے ہیں — میں اس جائزے کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

— ایک ہمارے عام معاشرے اور ریاست اور اس کے کاروبار کو چلانے والی حکومت کا جائزہ۔

— دوسرے اس نظام تعلیم کا جائزہ جو اس وقت ہماری تعلیم گاہوں میں رائج ہے اور جن میں ان کل پرزوں کو ڈھلنا ہے جو مستقبل کی مشینری کے لئے بھی درکار ہیں اور

— تیسرے اس نسل کا جائزہ جو آج کالجوں اور اسکولوں میں زیر تربیت ہے اور جسے مستقبل میں ملک و ملت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ہے۔ اس جائزے کے سلسلے میں جو مسائل مجھے آپ حضرات کے سامنے رکھنے ہیں ان کے ساتھ ہی میں ان کا وہ حل بھی عرض کروں گا جو ہمارے پیش نظر ہے۔

## عوام اور حکومت

معاشرے، ریاست اور حکومت کے جائزے میں تین چیزیں بالکل روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہیں۔

اول وہ دینی اور اخلاقی انحطاط کہ جو اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دینی معیار اس حد تک گر گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب بھیجنے میں ہمیں کس قدر ڈھیل

بیٹھے ہے۔ اور عام اخلاق بھی اس درجہ گم ہو گیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس اخلاق کے ساتھ ایک ہیئت اجتماعی کو کس طرح برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف وہ سیاسی اور انتظامی بگاڑ ہے جو ہماری ملی اور ملکی زندگی کو گھن کی طرح کھا رہا ہے لیکن میں ان کی تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ ان کی اصلاح کا کام براہِ راست طلبہ کو متعلق نہیں ہے بلکہ خود عوام سے متعلق ہے یا حکومت سے۔ ہمارے پاس تو اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ آئندہ آنے والی نسلوں کی اخلاقی تربیت کی کوشش کی جائے اور اسے میں پھر بیان کروں گا۔

تیسری چیز انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی معاشی بدحالی ہے۔ اور یہ چیز چونکہ ہم طلبہ پر بھی براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے اس لئے اس معاملے میں میں ذرا تفصیل میں جانا پسند کروں گا — یہی وہ عام اقتصادی خباثت ہے جس کے پیش نظر طلبہ کے وہ مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا ذکر میں نے اپنی گفتگو کے شروع میں کیا تھا۔ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ معاشی بدحالی اپنی گہری جڑیں رکھتی ہے اور اس کے اسباب بہت دور رس ہیں اور یہ کہ اس کا علاج فوری طور پر ممکن نہیں — اور یہ صرف طلبہ ہی پر نہیں ملک کے ایک ایک فرد پر مسلط ہے لیکن ہم اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس ملک کے سیاسی رہنما اس صورتِ حال کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اپنی گدیوں کی حفاظت میں لگے ہیں اور انہیں اپنے سیاسی جوڑ توڑ سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اس ملک کے عوام کی معاشی بدحالی کو دور کرنے کی فکر کر سکیں — اس سال اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کے آرگن "اسٹوڈنٹس وائس" (Students Voice) نے اپنے طور پر جو استصواب طلبہ کی معاشی حالت کے سلسلے میں کیا ہے اس کے نتائج اتنے زیادہ قابلِ اعتماد تو نہیں جتنے حکومت کے کسی استصواب کے ہو سکتے ہیں۔ تاہم ان سے پتہ چلتا ہے کہ طلبہ کس قدر شدید قسم کے معاشی بحران میں مبتلا ہیں اور کس کس طور پر تعلیم کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔

- اس استصواب کے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۱ فی صد طلبہ ۔/۲۰۰ روپے سالانہ کے قریب فیس ادا کرتے ہیں۔ بیالیس فی صد طلبہ ۔/۱۰۰۰ اور ۔/۱۵۰۰ ادا کرتے ہیں اور صرف تین فی صد طالب علم ہیں جنہیں اسکالرشپ ملتا ہے۔
- تعلیم کے کل سالانہ خرچ کے سلسلے میں استصواب بتاتا ہے کہ ۵۰ فی صد طلبا کو تقریباً ۔/۱۵۰ روپے سالانہ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ ۵۹ فی صد طلبہ تقریباً ۔/۵۰۰۰ روپے سال میں خرچ کرتے ہیں اور ۱۹ فیصد کو اس سے بھی زیادہ رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔
- پھر اسی سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ۳۰ فی صد طلبہ کو تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے ملازمت کرنی پڑتی ہے۔ ان میں سے ۶۰ فیصد جز وقتی ملازم ہیں کہ جو بہت کم کما پاتے ہیں اور ۴۰ فی صد کو اپنے گھر کے

ؔ واضح رہے کہ یہ تقریر [illegible] میں کی گئی تھی۔



اخراجات بھی خود برداشت کرنے ہوتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ طلبہ کو تعلیم کی کس قدر گراں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور وہ کن حالات میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

**گرانیٔ تعلیم کا علاج**

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال کا علاج کیا ہے۔

اس سلسلے میں جہاں ہمارا یہ مطالبہ کرنا غلط ہے کہ حکومت فوراً ہمارے تمام مسائل کو حل کر دے اور چشم زدن میں ہماری تمام مالی مشکلات کو آسان بنا دے وہاں ارباب کار کا ہم سے یہ توقع رکھنا بھی غلط ہے کہ ہم بس چپ چاپ انہیں کرسیوں اور گدیوں کی جنگ میں مصروف دیکھتے رہیں اور ان سے اس بات کا مطالبہ نہ کریں کہ وہ اپنی امکانی حد تک صورتِ حال کی اصلاح کی فکر کریں۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا اپنے مسائل کو مطالبات بنا کر اٹھانا اور پھر جلوس نکالنا اور ہڑتالیں کرنا قوم اور ملک دونوں کے حق میں مضر ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت بھی اس بات کو محسوس کرے کہ اگر اس نے صورتِ حال کی اصلاح کی پوری کوشش نہ کی اور ان مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ نہ کی جو اس ملک کے طلبہ کو درپیش ہیں تو پھر یہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سی مشکلات ایک ایسے آتش فشاں کی شکل اختیار کر سکتی ہیں جسے پھٹنے سے روکنا کسی کے بس کی بات نہ ہو گی۔ اس سال کراچی کے واقعہ سے جو تجربہ ہماری حکومت کو ہو چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد بھی مزید تجربات کی کوشش کرنا اگر حماقت نہیں تو کم فہمی ضرور ہے۔

ان مسائل کے حل کی جو صورتیں ہم نے مفید پائی ہیں وہ دو ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ ان کو پورے ٹھنڈے دل سے سمجھنے اور سمجھانے کے موڈ میں ذمہ دار لوگوں کے سامنے رکھا جائے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ طلبہ کی مشکلات کو خود اپنی مشکلات سمجھتے ہوئے ان پر ہمدردانہ غور کریں اور جس حد تک ان کے امکان میں ہو انہیں دور کریں۔ اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ طالب علم چوکنے ہوں اور اپنی باگ ڈور ایسے سنجیدہ لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو معاملات کو پیچیدہ بنا کر اپنی لیڈری کا ڈھونگ نہ رچانا چاہتے ہوں۔ بلکہ واقعی مسائل کا حل چاہتے ہوں اور نظامِ تعلیم کے کار پرداز اور حکومت کے ارباب کار پوری سنجیدگی سے معاملات پر غور کریں اور جو کچھ وہ کر سکتے ہوں اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ طالب علم "اپنی مدد آپ" کے اصول پر عمل پیرا ہوں اور اپنی جن مشکلات کو حل کر سکتے ہیں خود حل کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جتنی قوت طلبہ اپنے مسائل کو حکومت کے سامنے رکھنے اور اس کے لئے آواز اٹھانے میں صرف کرتے ہیں اگر اتنی ہی قوت وہ اپنے مسائل کو خود حل کرنے میں صرف کریں تو

مسائل کا معتدبہ حصہ آپ سے آپ حل ہو جائے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے جو کہ آپ واقعی ان مسائل کا حل ہی چاہتے ہوں اور انہیں اٹھانے میں کوئی اور غرض آپ کے پیشِ نظر نہ ہو۔

## نظامِ تعلیم کی خرابیاں

عام معاشرے اور ریاست کے اس جائزے کے بعد اب ذرا اس نظامِ تعلیم پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جس کے تحت ہم تربیت پا رہے ہیں۔

موجودہ نظامِ تعلیم میں دو طرح کی خرابیاں ہیں:۔

(ا) — ایک تو وہ قسم کی جنہیں طریقِ تعلیم کی خرابیاں کہا جا سکتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا بہت پرانا طریقہ رائج ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ ترقی ہو چکی ہے اس کا ہمیں بس اتنا علم ہے کہ دنیا کے کچھ حصوں میں ترقی یافتہ طریقوں سے تعلیم دی جا رہی ہے یہاں ابھی تک وہ طریقے استعمال نہیں کئے جا رہے — اسی سلسلے میں کچھ اور شکایتیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ امتحان کا طریقہ غلط ہے — اساتذہ کی تنخواہیں کم ہیں۔ لائبریریاں کم ہیں۔ کھیلوں کا انتظام اچھا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

(ب) — لیکن ہم جن خرابیوں کو اصل میں خطرناک اور مہلک سمجھتے ہیں وہ دوسری قسم کی ہیں اور انہی کو حقیقت میں نظامِ تعلیم کی خرابیاں کہا جا سکتا ہے اور وہ اس نظامِ تعلیم کی بنیادوں سے متعلق ہیں۔

(۱) ہمارے نزدیک اس نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اب تو یہ بالکل بے مقصد ہے لیکن اس کے مرتب کرنے والوں نے ٹھیک اپنے مقاصد اور اپنی اغراض کے پیشِ نظر اس کا مقصد "غلام سازی" رکھا تھا۔ انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے اقتدار کی گاڑی کھینچنے کے لئے دیسی قلی مطلوب تھے۔ اور ان دیسی قلیوں ہی کی تربیت کے لئے انہوں نے یہ نظامِ تعلیم مرتب کیا تھا جو ہمیں دورِ غلامی کی ایک وراثت کے طور پر ملا ہے۔

(۲) بے مقصدیت کے علاوہ اس نظامِ تعلیم کی دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں مغرب کے مرتب شدہ علوم جوں کے توں پڑھائے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مغرب میں علوم کا ارتقاء اور ان کی ترتیب ایک خاص نقطۂ نظر سے ہوئی ہے اور یہ نقطۂ نظر سراسر ملحدانہ ہے۔ یہ الحاد ان علوم میں اس طرح پیوست ہے کہ اس کو ان علوم سے علیحدہ کر کے نہ پڑھا جا سکتا ہے اور نہ پڑھایا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے علوم نہ صرف یہ کہ ہمارے کام کے نہیں بلکہ ہمارے نقطۂ نظر سے خطرناک ہیں۔

(۳) اس نظامِ تعلیم کی تیسری خرابی یہ ہے کہ اس میں ایک طالب علم کو صرف مجموعۂ علوم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کی سیرت و کردار کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔



## نئے نظامِ تعلیم کی ضرورت

یہ نظامِ تعلیم جو مندرجہ بالا تین بنیادوں پر قائم ہے اور جس میں ان اصولی خرابیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے فروعی نقائص بھی موجود ہیں ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ ہم زیادہ دیر تک اسے اپنے ملک میں برداشت کر سکیں۔ یہ نہ آزادی کی ضروریات پوری کرتا ہے اور نہ ہماری قومی خواہشات کی تکمیل میں ممد ہے۔ اب جو کام ہمارے پیشِ نظر یعنی پاکستان میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور پھر دنیا بھر میں اسلامی انقلاب کی علمبرداری اس کا تقاضا ہے کہ اس نظام کو جلد از جلد ہماری تعلیم گاہوں سے رخصت کیا جائے اور اس کی جگہ ایک نئے نظامِ تعلیم کو رائج کیا جائے جو ہماری ضروریات کو پورا کر سکتا ہو۔

ہمارے اس نئے نظامِ تعلیم کا واضح اور مثبت مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہو جو خود مسلمان بن کر اٹھیں اور دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کر سکیں۔ یہ نظامِ تعلیم ہماری نسل کو مسلمان بنا کر اٹھائے اور ان میں ان صلاحیتوں اور قوتوں کی نشوونما اور استحکام کرے جو دنیا میں اسلامی انقلاب لانے کے لئے ناگزیر ہیں۔

اس مقصد کے پیشِ نظر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نظامِ تعلیم کے لئے علوم و فنون کو خالص خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے مرتب کیا جائے۔ میں یہاں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا صرف اختصار سے عرض کروں گا کہ اس سے ہماری مراد صرف یہ نہیں ہے کہ اسلامیات کے مضمون کو لازمی قرار دیا جائے بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ تمام علوم کو از سرِ نو اسلامی نقطۂ نگاہ سے مرتب کیا جائے اور مغرب کے فلسفے اور عمرانیات کو یہاں صرف تنقیدی نقطۂ نگاہ سے پڑھایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسلام انسانی زندگی کے لئے جو ہدایات دیتا ہے وہ یہ ہیں اور اسے چھوڑ کر انسانوں نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں وہ یہ ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ نظامِ تعلیم طلبہ کی سیرت و کردار کی تعمیر کی ذمہ داری بھی لے — اسلام کے مطلوب لوگ وہی ہو سکتے ہیں اور دنیا میں اسلامی انقلاب کا کام انہی لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پا سکتا ہے جو سیرت و کردار کے اعلیٰ ترین مقامات پر سرفراز ہوں اور ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہمارے نظامِ تعلیم کا فرض ہونا چاہئیے۔

یہ وہ بنیادی تبدیلیاں ہیں جو اس نظامِ تعلیم میں ہم چاہتے ہیں لیکن حاشا و کلا ہمارا ارادہ یہ نہیں ہے کہ اس معاملے کو ایک سیاسی نعرہ بنا لیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ نظامِ تعلیم میں اتنا بڑا اور ایسا بنیادی انقلاب فوری طور پر نہیں لایا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو ابھی نہ خود طلبہ میں، نہ عوام میں اور نہ اربابِ حکومت میں — یہ احساس اور شعور پوری طرح پیدا ہو سکا ہے کہ نظامِ تعلیم میں اس طرح کی تبدیلی کی ضرورت ہے اور دوسرے یہ کام واقعی بڑا کٹھن ہے اور بڑی محنت چاہتا ہے اور اس بات کا طالب ہے کہ کچھ ہمت والے اہلِ علم اس کام کو اپنے

نے میں اور عوام کی اندرسی تدوین کا کام کریں تاہم اس معاملے میں جو کچھ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے وہ یہ ہے کہ

(۱) ایک طرف طلبہ میں عموماً اور عوام میں خصوصاً یہ احساس پیدا کیا جائے کہ یہ نظام تعلیم انتہائی ناقص ہے، اور ان اجتماعی خواہشات اور ارادوں کے پورا کرنے کی کوئی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا جو ہمارے پیش نظر ہیں

(۲) دوسری طرف اہل علم حضرات کو اس طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ مطلوبہ نظام تعلیم کی بنیادوں کو واضح طور پر مرتب کریں اور وہ طریقہ بتائیں کہ جس سے موجودہ نظام تعلیم کو آہستہ آہستہ نئی ضروریات کے مطابق ایک بالکل نئے نظام تعلیم میں تبدیل کیا جا سکے۔ اور

(۳) تیسری طرف حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ تدریجاً ایسے اقدامات کرے جن سے نظام تعلیم میں مطلوبہ تبدیلی لائی جا سکے۔

یہ تینوں کام اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ جن طلبہ نے اس کام کی اہمیت کو محسوس کیا ہو وہ منظم ہو کر ایک تنظیم بنائیں اور یہ تینوں کام کرنے کی کوشش کریں۔

**طلبا کا جائزہ**

اس جائزے میں تیسرے نمبر پر خود طلبہ ہیں اور اساتذہ حضرات کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خرابیاں پورے طور پر خود ان میں بھی نفوذ کئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اقامت دین کے سلسلے میں اصل کام ہم طلبہ ہی کو کرنا ہوگا ۔۔۔ اس لئے جو بیماریاں ہم اپنے اندر چھپائے پھر رہے ہیں۔ ان کی صحیح تشخیص اور ان کے علاج کی فکر بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں کچھ طرف داری برتنا اور سارے کا سارا الزام حکومت پر ڈال دینا صحیح نہیں ہے ۔۔۔ ہمیں اپنی خرابیوں کا جائزہ کچھ زیادہ ہی باریک بینی سے لینا چاہئے چنانچہ میں اس معاملہ میں بھی ذرا تفصیل سے کام لوں گا۔

(۱) فکر و دانش سے بےخبری ۔ سب سے پہلی بات جو مجھے کھٹکتی اور آپ کو بھی کھٹکتی ہوگی وہ وہ بے حسی اور لاپرواہی ہے جو زندگی کا معمول بن گئی ہے۔ بہت کم طلبہ ایسے ہیں جنہوں نے زندگی کے بنیادی مسائل پر کبھی سوچا ہے اور ان میں ان لوگوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کی مقدار جتنی ہے جنہوں نے سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا کوئی مقصد اور مصرف بھی تجویز کیا ہے

اکثر ایسے ہیں جنہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ اب ہم آزاد ہیں اور اس حیثیت سے ہماری حالت اس حالت سے مختلف ہے جو اس سے ساٹھ سال قبل تھی۔ ہم میں سے ننانوے فی صد لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے بلکہ اس بات سے بھی کہ خود ان کے ملک میں کیا ہو رہا ہے ۔۔۔ اب آپ خود سوچئے کہ اس قدر بے حسی اور بے ہوشی کس بات کا اشارہ کرتی ہے یقیناً اس بات کا کہ ہم میں بس دم عبور کا جہان ہے۔

[illegible]



(۲) دینی اور اخلاقی حالت ۔ دوسری بات جسے میں نہایت اہم سمجھتا ہوں یہ ہے کہ ہمارے طلبہ کا دینی معیار گرتے گرتے صفر تک پہنچ رہا ہے ۔۔۔ دین کا علم یہاں عام کو بھی نہیں تھا دین کی بنیادی تعلیمات تک سے وہ لوگ بے خبر ہیں جو عنقریب گریجویٹ بننے والے ہیں جیسے نماز روزہ اور دوسرے دینی فرائض تو ان پر عمل پیرا ہونا تو کجا ان کے مذاق اڑانے تک کو اب فیشن کا مقام حاصل ہو چکا ہے۔

عام اخلاقی حالت بھی بے حد دگرگوں ہے ۔۔۔ اور اس کا اندازہ آپ سب حضرات کو بھی اچھی طرح ہے ۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ زیادہ تفصیل سے اس معاملہ پر گفتگو کروں۔ ہمارا اخلاق جس درجہ گر گیا ہے اس کا بھی شب و روز مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اس سال کراچی کے طلبہ نے اور وہ بھی کالجوں کے نہیں بلکہ ہائی اسکولوں کے طلبا نے لاہور جاتے ہوئے جو ہڑبازی کی تھی وہ ابھی ایک تازہ واقعہ ہی ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اخلاق کو کس درجہ گھن لگ چکا ہے ۔۔۔ اسی طرح پچھلے یوم استقلال پر جو کچھ ہوا تھا اسے کون نہیں جانتا صرف ان دو باتوں سے بھی اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری اخلاقی حالت کس قدر زبوں ہو چکی ہے

۳۔ تعلیمی معیار ۔ پھر تعلیمی معیار کے بارے میں آئے دن خبریں سننے میں آتی رہتی ہیں کہ وہ دن بدن گر رہا ہے۔ امتحانوں میں کامیابی کا فیصد تناسب بہت گر چکا ہے پھر جو پاس ہوتے ہیں وہ بھی فی الواقع معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محنت کرنے کا مادہ بالکل ختم ہو رہا ہے اور محنت سے جی چرانے کی عادت عام ہو رہی ہے۔

کم و بیش یہ ہے وہ حالت کہ جس میں خود ہم طلبہ گرفتار ہیں ۔۔۔ ظاہر بات ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ وہ غلط نظام تعلیم ہے جس کے تحت ہم نے پرورش پائی ہے اور اس کا واحد علاج ایک صحیح اسلامی نظام تعلیم ہے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ ابھی تو صحیح اسلامی نظام تعلیم کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا کجا کہ اس کے نفاذ کی امیدیں وابستہ کی جائیں اور ان امیدوں پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہا جائے

یہ صورت حال ایک فوری علاج کا مطالبہ کرتی ہے اور جہاں تک عقل کام کرتی ہے اس کا علاج صرف یہ نظر آتا ہے کہ جب تک ایک مکمل اسلامی نظام تعلیم درس گاہوں میں جلوہ گر نہیں ہوتا وہ طلبہ جنہیں اصلاح کی ضرورت کا احساس ہے اور جو کم از کم اپنے بارے میں طے کر چکے ہیں کہ انہیں اقامت دین ہی کا کام کرنا ہے منظم ہوں اور اس مجبوری کے دور میں امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ طلبہ کو موجودہ غلط نظام تعلیم کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں اور ان کے لئے اس علمی اور اخلاقی تربیت کا اہتمام کریں جو انہیں ایک اسلامی نظام تعلیم مہیا کرتا۔ علاوہ ازیں زیادہ سے زیادہ طلبہ تک اسلام کی دعوت پہنچانے اور ان میں اصلاح کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کریں پھر ان لوگوں کو جو اس جذبے سے ہمکنار ہو جائیں ایک نظم میں منسلک کریں اور ان کی اخلاقی اور علمی تربیت کی کوشش کریں ۔۔۔ حضرات [illegible]

[illegible]

# ایک اہم اعلان

'میثاق' کے پرانے پرچوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ اتفاق سے جنوری [illegible] سے فروری [illegible] تک جتنی اشاعتیں شائع ہوئی ہیں۔ ان سب کی ایک محدود تعداد تسلسل کے ساتھ دفتر میں موجود ہے۔ ان میں

**مکمل مقدمہ** اور

**پورے تفسیر سورۂ آل عمران کے علاوہ**

مندرجہ ذیل مضامین ——— شائع ہوئے ہیں

## افادات فراہی ؒ

* حکومت الٰہی * عقیدۂ شفاعت * نفس میں گناہوں کا سرچشمہ اور * مصائب و تکالیف کا سرچشمہ

## مقالات مولانا ضیاء الدین اصلاحی

* قرآن کی اثر انگیزی * قرآن و حدیث کی باہمی نوعیت * رسول اللہ صلعم کی خبر احاد کی حجیت،

## تذکرہ و تبصرہ میں مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے

* [illegible] کے صدارتی انتخابات کے نتائج پر تبصرہ * جماعت اسلامی ہند سے گفتگو * ابو صالح مرحوم کی یاد میں
* ہندوستان سے سترہ روزہ جنگ پر تبصرہ * "میثاق" کا اولین اداریہ * دین کا کام کرنے والوں کو مشورے

——— جناب خالد مسعود کے ———

* لندن سے دو خطوط اور * زکوٰۃ پر مقالے کی پانچ اقساط

——— جناب کوثر نیازی کا ———

* استعفےٰ از رکنیت جماعت اسلامی اور * اسی سلسلے میں مولانا مودودی کے مراسلت

## ڈاکٹر اسرار احمد کے قلم سے

* تحریک جماعت اسلامی: "ایک تحقیقی مطالعہ" پر تبصروں کا جائزہ
* اسی سلسلے کے مضمون "نقض غزل" کی پانچ اقساط میں جائزہ کمیٹی سے باہمی گفت و شنید کے واقعات کا تذکرہ
* اسی ضمن میں چوہدری محمد اکبر صاحب کے مکتوب کا جواب
* حقیقت زندگی ——— اور ———
* نجات کی راہ: سورۃ والعصر کی روشنی میں

ان چودہ اشاعتوں کی مجموعی قیمت آٹھ روپے ستر پیسے بنتی ہے لیکن انہیں تین چوتھائی قیمت پر یعنی ساڑھے چھ روپے میں حاصل کیا جا سکتا ہے!

لاہور سے باہر کے حضرات اس کے علاوہ اسی پیسے محصول ڈاک یعنی کل سات روپے تیس پیسے منی آرڈر ارسال فرمائیں یا بذریعہ وی پی پی طلب کریں۔

جو حضرات ا

وہ "تح

ایک ... مطالعہ

اور

"تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ"

بھی طلب فرمائیں انہیں یہ کتابیں بھی تین چوتھائی قیمت پر ارسال کی جا

نوٹ: یہ رعایت صرف ان سب کو اکٹھے طلب فرمانے کی صورت میں

## دارالاشاعت الاسلامیہ

بالمقابل ڈاک خانہ، کرشن نگر، لاہور نمبر ۱۲